آنکھ مچولی
اگست ۱۹۹۱ء
عالم چنا اچانک آنکھ مچولی کے دفتر آگئے
آٹھ انچ لمبی زبا
اس شمارے میں
پڑھیے بھی دیکھیے بھی
۳۰۰۰ء میں جو کچھ ہو
وہ آج ہی پڑھ لیجیے
ضرورت ہے روسی کتوں ک
مگر کیوں کس لیے؟
کیا ہم واقعی پاکستانی ہیں
اپنا جائزہ خود لیجیے
مزے دار کہانیاں
لطیفے
نظمیں
اور بہت سی دلچسپیوں کے علاوہ
نئے انداز کا "تتلی"
بالکل مفت

Montgomery

The Height of Delight!

Orient

مسلسل دُوسری بار اعلیٰ معیار کا ایوارڈ حاصل کرنے والا
پاکستان کا واحد ماھنامہ

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

آنکھ مچولی

مدیرِ اعلیٰ	ظفر محمود شیخ
مدیر مسئول	تجمل حسین چشتی
مشاورت	مشفق خواجہ امجد اسلام امجد
مدیرانِ اعزازی	طاہر مسعود محمد سلیم مغل
مجلسِ ادارت	شاہ نواز فاروقی ساجد سعید منیر احمد راشد
اشتہارات	محمد عرفان
سرکولیشن	ریاض احمد
نمائندہ امریکہ	عبدالرشید خان

رُکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے تصدیق شدہ اشاعت

ماہ نامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جا سکتی۔

ماہ نامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمّہ دار نہ ہوگا۔

ماہ نامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیر سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا۔

فون نمبر ۲۹۹۱۷۸

جلد نمبر ۶ شمارہ نمبر ۲ اگست ۱۹۹۱ء محرّم / صفر ۱۴۱۲ھ

قیمت ۱۰ روپے ۷ ریال ۷ درہم

ناشر: ظفر محمود شیخ طابع: زاہد علی مطبع: لاریب پرنٹنگ پریس ایم اے جناح روڈ کراچی

خط و کتابت کا پتہ: ماہ نامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی، ۱۱۲۔ڈی نورس روڈ سائٹ کراچی

تاریخ کے دریچے سے ـــــ ادارہ ـــــ ۶
پہلی بات ـــــ ظفر محمود شیخ ـــــ ۷
ڈیئر ایڈیٹر ـــــ خطوں کے جواب ـــــ ۹
کیا ہم واقعی پاکستانی ہیں؟ ـــــ ط۔م۔ شائستہ زرّیں ـــــ ۱۳
کیسا زبان دراز ـــــ اُسامہ بن سلیم ـــــ ۱۶
ایک آئیڈیل جج ـــــ محمد طاہر اختر ـــــ ۲۰
معصوم ـــــ مُنیر احمد راشد ـــــ ۲۵
پلاسٹک کا زمانہ ـــــ سیّد طارق محمود ـــــ ۳۱
گاؤں کی ندی (نظم) ـــــ شبیر بیگ ناز ـــــ ۳۴
ضرورت ہے دیسی کُتّوں کی ـــــ اخگر انوار اعوان ـــــ ۳۵
عالم چینا دفتر آنکھ مچولی میں ـــــ طاہر مسعود ـــــ ۳۸
مسٹر حیرت اور مسٹر ناک کی کہانی ـــــ شیخ عبدالحمید عابدؔ ـــــ ۴۷
ڈنڈا ڈولی ـــــ قارئین ـــــ ۵۱
یہ دُنیا سن تین ہزار میں ـــــ شاہنواز فاروقی ـــــ ۵۶
بارش اور بچّے ـــــ غلام عباس طاہر ـــــ ۶۵

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

حُسنِ ترتیب

بچپن کی یادیں (نظم)	عمّارہ	۶۸
الیکٹرانی دماغ، کمپیوٹر	ساجد سعید	۶۹
آرٹ کے عجیب و غریب نمونے	سلمیٰ سلیم	۷۲
آتش فشاں	سلیم مغل	۷۵
قیمتی سرمایہ	میرزا ادیب	۸۱
فطرت کی دُنیا	شین فاروقی	۸۸
آزادی	سیّد نظر زیدی	۹۱
ریل کا سفر	سیّد مسعود حسن رضوی ادیب	۹۹
ادے کا بدلہ	امان اللہ نیّر شوکت	۱۰۲
کورسان کی چٹانیں	سیّد غلام جیلانی	۱۰۳
ایک عظیم شخصیت	سلمان صدیق احمد	۱۱۱
مچھیرا اور بیل (نظم)	عبدالقادر	۱۱۴
کم سن قلم کار	قارئین	۱۱۷
روشن مثال	تعارف	۱۲۸
امّی ابّو کا صفحہ		۱۳۰

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

حُسنِ ترتیب

تاریخ کے دریچے سے

قائد اعظم محمد علی جناح دہلی میں ایک بڑے جلسے سے خطاب کرنے کے بعد پنڈال سے واپس جانے لگے تو ایک اجنبی شخص اچانک قائد اعظم کے سامنے آگیا۔ اس نے ملتجی نظروں سے قائد اعظم کو دیکھا اور درخواست کی کہ میری بچی آپ سے مل کر آپ کو ایک تحفہ دینا چاہتی ہے۔ آپ ہمارے گھر تشریف لے چلیں۔ قائد اعظم نے یہ دعوت قبول کر لی۔

قائد اعظم سے ملاقات ہوئی تو بچی نے انہیں کپڑے کا ایک رومال پیش کیا جس پر بڑی محنت سے پاکستان کا نقشہ کڑھا ہوا تھا۔ یہ نقشہ قیام پاکستان سے قبل اس بچی نے خود ہی بنایا تھا۔ قائد اعظم کو بچی کے جذبے نے بے حد متاثر کیا اور وہ اس واقعے کو بھلا نہ سکے۔

کچھ عرصے بعد جب شملہ کانفرنس میں کانگریس نے لارڈ ویول کے ذریعے قائد اعظم کو متحدہ ہندوستان کے گورنر جنرل کی پیش کش کرتے ہوئے یہ درخواست کی کہ وہ پاکستان کے معاملے سے دستبردار ہو جائیں تو قائد اعظم نے اپنی جیب سے بچی کا دیا ہوا رومال نکال کر لارڈ ویول کو دکھایا اور کہا میں نے دس کروڑ مسلمانوں کے علاوہ اس بچی سے پاکستان دینے کا وعدہ کیا ہے۔"

پہلی بات

آپ نے شاید غور کیا ہو کہ جب بھی کوئی پاکستانی پندرہ بیس سال امریکہ یا یورپ میں گزار کر واپس وطن آتا ہے تو اس کی بول چال، عادت واطوار، لباس، رہن سہن سوچنے کا انداز غرض یہ کہ ہر چیز پر امریکہ یا یورپ کی چھاپ واضح طور پر نظر آجاتی ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو اس پاکستانی کو خود اپنے وطن میں دوبارہ ایڈجسٹ کرنے میں شدید مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسے جابجا گندگی کے ڈھیر برے لگتے ہیں۔ بسوں میں دھکم پیل سے اسے وحشت ہوتی ہے۔ لوگوں کو خواہ مخواہ وقت ضائع کرتے دیکھ کر اسے افسوس ہوتا ہے۔ تعلیمی اداروں میں سیاست اور نعرے بازی اس کے لئے تعجب کا باعث ہوتی ہے۔ دفتروں میں کام چوری اور نکمے پن سے وہ عاجز آجاتا ہے۔ آئے دن بجلی کا غائب ہوجانا، نلکوں سے پانی کا نہ آنا، بے ایمانی، چور بازاری اور رشوت کا بازار گرم ہونا...... اور سب سے بڑھ کر قانون کو بے بس اور مجرموں کو کھلے بندوں آزاد پھرتے دیکھنا اس کے لئے اتنا تکلیف دہ ہوتا ہے کہ بالآخر وہ وطن کو ایک بار پھر خیر آباد کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے ہم اس بات کو پسند نہیں کر سکتے کہ اپنے ملک کو مسائل میں گھرا پا کر کوئی اسے خیر آباد کہے۔ لیکن یہ بھی ہمارے لئے سوچنے کی بات ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے کہ ایک پاکستانی پندرہ بیس سال امریکہ میں رہ کر پکا امریکی تو بن جاتا ہے لیکن ہم چالیس پینتالیس سال میں اچھے پاکستانی نہیں بن پاتے۔ پاکستانی رگوں میں امریکی تہذیب اور امریکی طرز زندگی تو خون کی طرح دوڑنے لگتے ہیں، لیکن ان ہی رگوں میں خود پاکستان کی محبت، اس کی ترقی اور اس کے لئے قربانی دینے کا جذبہ کیوں جوش نہیں مارتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگ پاکستان سے تو سب کچھ مانگتے ہیں، دولت، عزت، سکون واطمینان، خوشحالی سبھی کچھ...... لیکن ہم خود پاکستان کو کچھ دینے پر تیار نہیں ہوتے۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ دنیا میں آج جتنی بھی ترقی یافتہ قومیں نظر آرہی ہیں ان کے لوگوں نے اپنے ملک کو اس مقام تک پہنچانے کے لئے دن کا چین اور رات کا آرام اپنے اوپر حرام کرلیا۔ انھوں نے کہا کہ میری ذات سے زیادہ میرا ملک اہم ہے۔ کیونکہ میں رہوں نہ رہوں میرا ملک تو باقی رہنے والا ہے اس لئے جہاں میرے ملک کا فائدہ ہوگا وہاں میں اپنا فائدہ چھوڑ دوں گا۔ یہی وہ جذبہ ہے جس سے جاپان نے ترقی کی اور دوسری جنگ میں شکست کھا جانے والے اس ملک نے مسلسل محنت اور جذبہ قربانی سے اپنی شکست کو فتح میں تبدیل کر دیا۔ تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اسی جذبے کو کام میں لاتے ہوئے ہم اپنے ملک کے مسائل پر قابو نہ پاسکیں اور اسے ترقی یافتہ ممالک کی صف میں نہ لاسکیں۔ ہمارے بزرگوں نے ہمیں یہ وطن بنا کر دیا اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اس کی حفاظت کریں اور جو کوتاہیاں پچھلی نسل سے ہوئیں اس کی تلافی نئی نسل کی جانب سے ہو۔ قوموں کی ترقی کا راز اسی حقیقت میں پوشیدہ ہے!

آپ کا دوست
ظفر محمود شیخ

کچھ عرصے بعد اکثر پالش

سوکھ

جاتی ہیں...

ریکٹ اینڈ کولمین

نے اس مسئلے کی تحقیق کے بعد

بہترین حل تلاش کر لیا ہے

نیا

ویکس بلینڈ

چیری بلاسم

چیری بلاسم کا نیا ویکس بلینڈ فارمولا اب طویل مدت تک بغیر سوکھے موثر رہتا ہے اور جوتوں کو گہری اور شاندار چمک دیتا ہے چیری بلاسم اب نئے انٹرنیشنل ڈیزائن پیک میں دستیاب ہے اپنے جوتوں کی حفاظت کے لئے پاکستان میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والی شو پالش چیری بلاسم ہی استعمال کیجئے۔

گہری اور شاندار چمک کیلئے

manhattan PAKISTAN

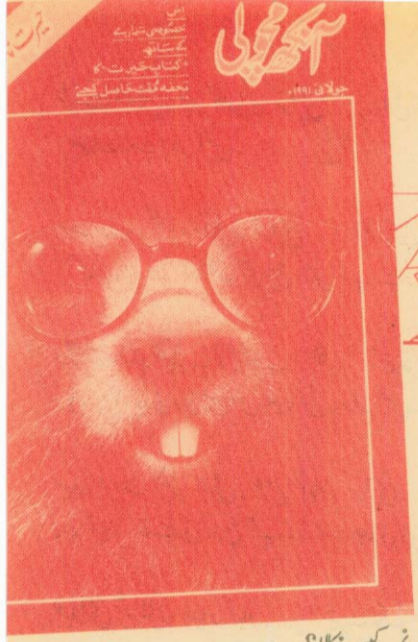

ڈیئر ایڈیٹر

فاخرہ خانم، لیاقت آباد، کراچی..... پہلی مرتبہ آنکھ مچولی کو نئے انداز میں دیکھا۔ حیرت ناک نمبر کی واقعی سطر سطر تحقیق اور لفظ لفظ تحقیق سے عبارت تھا۔ مجھے تواب تک یہ حیرت ہو رہی ہے کہ آپ نے یہ حیرت ناک نمبر کیسے نکالا؟

محمد شفیق، قصور ..... انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کی طرف سے انعامی شیلڈ ملنے پر مبارکباد قبول کیجئے۔ "حیرت ناک نمبر" پڑھ کر ہم حیرت کا بت بنے رہ گئے۔ ہر تحریر پڑھ کر ہماری آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں اِتنا اچھا حیرت ناک نمبر نکالنے اور کتاب حیرت کا تحفہ دینے پر ہماری طرف سے بہت بہت شکریہ۔

عمران خالد خان، فیڈرل بی ایریا، کراچی ..... میں نے آنکھ مچولی کا خوفناک نمبر، کہانی نمبر اور اطفال نمبر بھی پڑھا تھا لیکن حیرت ناک نمبر، تو بہت ہی خوبصورت کاوش ہے "آنکھیں دیکھتی رہ جاتی ہیں" "وہ دو بچے" "کھیلوں میں حیرت کے لمحے" "برمودا ٹرائینگل" اتنے خوبصورت مضامین تھے کہ بار بار پڑھے گئے۔ کہانیوں میں سرفہرست "سولہ سال بعد" تھی۔ کیا یہ فرضی واقعہ تھا یا سچا تھا؟

سید محمد جنید عالم، حیدر آباد ..... "حیرت ناک نمبر" کی کامیابی پر میری جانب سے مبارکباد۔ لیکن رسالے کی قیمت میں آپ نے اضافہ کر دیا ہے۔ قیمت کم کر لیجئے اور رسالے میں ذہنی مقابلے شروع کیجئے۔

محمد سعد منیر (؟) حیرت ناک نمبر ملا..... دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

ثروت اسحاق، ملیر کالونی، کراچی..... جولائی کا شمارہ پڑھ کر آنکھیں حیرت زدہ رہ گئیں۔ تمام کہانیاں اور معلومات بہت پسند آئیں۔

سعد سارہ، گلشن اقبال، کراچی..... آنکھ مچولی کا ہر نمبر بہترین ہوتا ہے اور اس دفعہ "حیرت ناک نمبر" اور "کتاب حیرت" کا تحفہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔

راؤ محمد شاہد اقبال، نوابشاہ..... انکل! "حیرتناک نمبر" نے پہلی اور آخری مرتبہ قلم اٹھانے پر مجبور کر ہی دیا۔ واقعی پوری دنیا میں اس جیسا کوئی رسالہ نہیں۔

سیدہ فرحانہ ظفر جمال، عزیز آباد، کراچی..... جولائی کا "حیرتناک نمبر" سرسری طور پر دیکھا ہے، بہت پسند آیا۔ مقابلے کی تاریخ آپ نے بہت جلدی کی دی ہے۔ لہٰذا اتنی جلدی جواب بھیجنا ممکن نہیں ہے۔

عبدالحئی شیرانی، حیدر آباد..... "حیرت ناک نمبر" کھولا تھا کہ رسالے نے مجھے حیرت کی گولی مار دی اور میرے چہرے پر سوراخ ہوگیا جو پورا رسالہ پڑھنے کے بعد ختم ہوا۔

شریف حملزئی بلوچ، ملیر، کراچی..... سچی بات تو یہ ہے کہ "حیرت ناک نمبر" پسند نہیں آیا۔ تحفہ بھی خاص نہیں تھا۔ قیمت بہت زیادہ اور صفحات بہت کم تھے اب کون سا نمبر نکالنے کا ارادہ ہے۔

محمد رفیق۔ کراچی..... "حیرتناک نمبر" اچھا ہے لیکن کچھ دبلا پتلا نظر آرہا ہے۔ امید ہے آئندہ خاص نمبر اور عام شمارے بھی تندرست ہوں گے..... ویسے آپ کی محنت رنگ لائی اور "حیرت ناک نمبر" حیرت ناک چیزوں سے بھرا پڑا ہے۔ تحفہ بھی خاصا حیرت زدہ کر رہا ہے۔

عاصمہ اسلم۔ اسلام آباد..... پہلی مرتبہ آپ کی محفل میں شرکت کر رہی ہوں اور اس کی وجہ آپ کا "حیرتناک نمبر" ہے۔ جونہی یہ میرے ہاتھ میں پہنچا تو میں اسی کی حیرت انگیز قیمت پڑھ کر حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہوتے ہوتے بچی۔ رسالے کا سرورق بجائے حیرتناک ہونے کے کچھ کچھ خوفناک تھا۔ لیکن جیسے جیسے میں رسالہ پڑھتی گئی، آنکھیں حیرت کے مارے کھلتی گئیں۔ میری طرف سے اتنا حیران کن نمبر نکالنے پر مبارک باد قبول کیجئے۔

غزالہ رمضان، ملیر ہالٹ، کراچی..... "حیرت ناک" نمبر ہاتھ میں آیا تو خوشی بھی ہوئی حیرت بھی اور غصہ

بھی آیا۔ خوشی اس وجہ سے کہ حیرتناک نمبر ہماری توقعات پر پورا اترا، اور ٹائٹل کو دیکھتے ہی ہمارے منہ نے "○" کی شکل بنالی۔ غصہ اس وجہ سے کہ معمے کے جواب کی آخری تاریخ ۳ جولائی کیوں رکھی؟

محمد معاویہ۔ ٹیکسلا..... حیرتناک نمبر کے ساتھ تحفے کا بہت بہت شکریہ۔

محمد بلال بخاری، کوٹ ادو..... آنکھ مچولی کا "حیرت ناک نمبر" پڑھا تو جی چاہا کہ اتنا اچھا نمبر نکالنے پر آپ کو ڈھیروں مبارک باد دوں۔ آنکھ مچولی کی واقعی پورے پاکستان میں کوئی مثال نہیں۔

خدیجہ حمید وانی، لاہور..... "حیرت ناک نمبر" پڑھ کر ہم حیرت میں پڑ گئے۔ قیمت دیکھ کر ہمیں اور حیرت ہوئی۔ بہرحال قیمت کو مار میں گولی۔ رسالہ تو ہم نے جیسے تیسے خرید ہی لیا۔ مگر رسالہ پڑھ کر ہمارے پیسے پورے ہوگئے۔ آنکھ مچولی جیسا رسالہ ہم نے کہیں نہیں پایا۔

محمد یونس، فیڈرل بی ایریا، کراچی..... "حیرت ناک نمبر" نکال کر آپ نے ہمیں بھی حیرت میں ڈال دیا۔ واقعی اتنا اچھا رسالہ کبھی سنا نہ دیکھا۔ رسالہ بازار میں خاصی دیر سے آیا۔

صائمہ خواجہ، لاہور..... "حیرت ناک نمبر" پڑھ کر منہ "○" کی طرح ہوگیا اور اب تک ایسا ہی ہے۔ ڈاکٹروں نے ہر چند کوشش کی کہ ہمارا منہ ٹھیک ہو جائے مگر..... اب تو ڈاکٹروں نے بھی جواب دے دیا ہے۔ کچھ کیجئے نا۔!

محمود علی خان، فہد علی خان، کراچی..... اس دفعہ آنکھ مچولی نے ہمیں لاجواب کر دیا۔ جیسے ہی بک اسٹال پر نظر آیا۔ ہم نے اٹھالیا اور حیرت زدہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ خوبصورت اور دلچسپ تصاویر سے بھرا ہوا آنکھ مچولی بہت زبردست لگ رہا تھا۔ "کتاب حیرت" کے دلچسپ کھیل بھی بہت مزیدار تھے۔

عبدالرزاق، ملتان..... دنیائے حیرت کے واقعات پڑھ کر بہت حیران اور خوش ہوا۔ اس جیسا رسالہ میں نے نہیں پڑھا۔ اس میں ایک چیز کی کمی ہے اور وہ ہے ذہنی آزمائش۔

محمد سلمان خان سنبل، بورے والہ..... آنکھ مچولی کی مسلسل دوسری بار بہترین رسالے کا ایوارڈ حاصل کرنے پر مبارکباد۔ کچھ افسوس بھی ہوا کہ پہلا انعام نہیں ملا۔ بہرحال یہ فرق ہمارے لئے کوئی خاص نہیں۔ رسالے میں ذہنی آزمائش کے مقابلے کی شدید کمی ہے۔ آنکھ مچولی ایک مکمل رسالہ ہے۔

شکریہ اور معذرت

○ ..... اس مہینے تمام خطوط "حیرت ناک نمبر" کے حوالے سے ملے۔ اس لئے تمام خطوط کے جوابات ایک ساتھ ہی دیئے جارہے ہیں۔ "حیرت ناک نمبر" آپ لوگوں کو پسند آیا۔ شکریہ۔ یہ آپ کو تاخیر سے ملا۔ معذرت۔ دیر ہونے کی وجہ بس اتنی سی ہے کہ ہم رسالے کو پریس میں بھیجنے سے پہلے تک اسے بہتر بنانے کی کوشش کرتے رہے۔ ہوا یوں کہ آخری وقت میں چند نہایت اچھے مضامین مل گئے۔ بس ہم لالچ میں آگئے کہ چلو چند ایک روز کی دیر سویر کی کوئی بات نہیں۔ پڑھنے والوں کو لطف آنا چاہئے۔ پھر بھی رسالے کو وقت پر لانے کی اہمیت سے انکار نہیں۔ جو ساتھی اس پر خفا ہیں وہ اپنا غصہ تھوک دیں۔ آئندہ احتیاط کی جائے گی۔ اس بار ہمیں ڈھیروں خطوط ملے، ان صفحات پر تھوڑے سے خط شائع کئے جارہے ہیں لہٰذا جو ساتھی اپنے خط چھپا ہوا نہ دیکھیں، ناراض نہ ہوں۔ ان کے جذبات ہم تک پہنچ گئے اور ان کی مبارک باد کا ہم خلوص سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔ "حیرت ناک نمبر" کے لئے ہمیں واقعی محنت کرنی پڑی۔ کسی ایک موضوع پر اتنی ساری چیزیں اکٹھی کرنا آسان کام نہیں۔ لیکن آپ لوگوں کی دلچسپی ہمارے حوصلوں کو بڑھاتی ہے، اسے تازہ دم رکھتی ہے۔ ہاں یاد آیا۔ بھئی رسالے کی قیمت کچھ ساتھیوں کو زیادہ لگی۔ اور کچھ ساتھیوں نے لکھا کہ رسالہ پڑھ کر قیمت وصول ہوگئی۔ لیجئے حساب برابر ہوا۔ چھوٹی بڑی غلطیاں ہر رسالے میں ہوتی ہیں، انہیں نظر انداز کر دینا چاہئے۔ کیوں کہ رسالے بھی انسان ہی نکالتے ہیں اور انسان کو غلطیوں کا پتلا کہا گیا ہے۔

ہم کیسے پاکستانی ہیں؟

ط۔م شائستہ زریں

۱۴ اگست پاکستان کی آزادی کا دن ہے۔

کم سے کم اس دن ہمیں یہ ضرور سوچنا چاہئے کہ ہم کتنے اچھے پاکستانی ہیں۔ اور پاکستان کی خدمت کے لئے ہم کیا کچھ کر رہے ہیں۔ ایک طالب علم ہو کر بھی ہم پاکستان کی خدمت کر سکتے ہیں۔ یہ جاننے کے لئے کہ ۱۴ اگست کا دن آپ ایک محبِّ وطن پاکستانی کی حیثیت سے کس طرح گزارتے ہیں۔ یہ سوالنامہ شائع کیا جارہا ہے۔ اس میں ہر سوال کا ایک نمبر ہے۔ اور یوں سارے سوالات کے بیس نمبر۔ ○ پنسل سنبھال لیجئے۔ اور ہر سوال کا جواب اپنے ضمیر کی سچائی کے ساتھ دیجئے۔ چونکہ اس وقت آپ اکیلے ہیں اس لئے آپ کو جھوٹ بولنے کی ضرورت

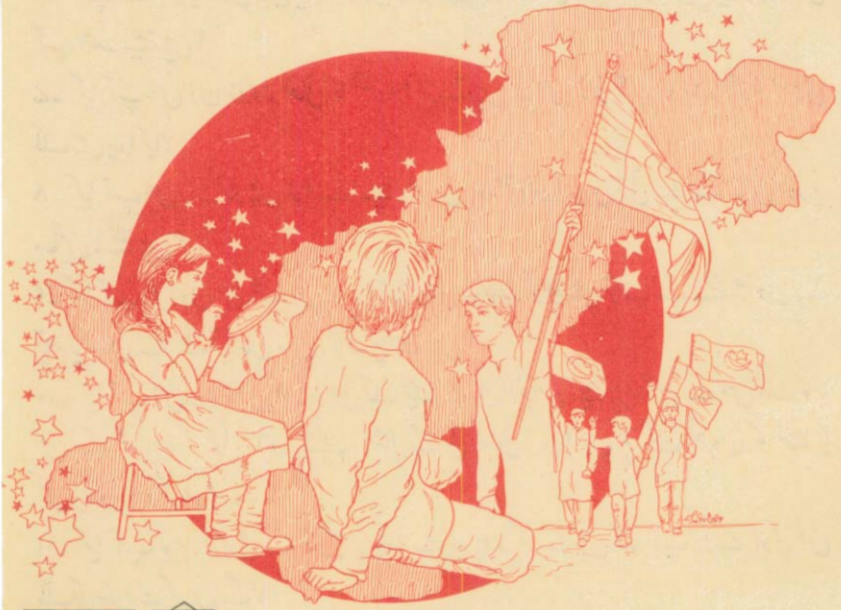

نہیں۔ جس سوال کا جواب "ہاں" ہو، اسے ایک نمبر دے دیجئے۔ اگر آپ بیس میں سے بیس نمبر حاصل کر لیتے ہیں تو آپ آئیڈیل پاکستانی ہیں، سولہ نمبر پر بہت اچھے پاکستانی ہیں، دس نمبر پر اچھے پاکستانی ہیں اور اس سے کم نمبر آئیں تو پھر اپنے آپ کو اچھا پاکستانی بنانے پر غور کرنا چاہئے۔

۱۔ کیا آپ ۱۳ اگست ہی سے یوم آزادی منانے کی تیاریاں شروع کر دیتے ہیں اور اپنے گھر اور گلی کو قومی پرچم کی جھنڈیوں سے سجاتے ہیں؟

۲۔ کیا آپ یوم آزادی کی صبح اپنے گھر پر قومی پرچم لہراتے ہیں؟

۳۔ کیا کسی کے گھر کی چھت پر پرچم لہراتے نہ دیکھ کر آپ شائستگی اور شرافت سے انہیں یاد دلاتے ہیں کہ وہ شاید پرچم لہرانا بھول گئے ہیں؟

۴۔ کیا آپ ۱۴ اگست کی صبح کو ریڈیو یا ٹیلی وژن پر یوم آزادی کی تقریبات دیکھتے ہیں؟

۵۔ کیا آپ اس روز کے اخبارات میں چھپنے والے ایسے مضامین پڑھتے ہیں جو قیام پاکستان کے حوالے سے لکھے گئے ہوں؟

۶۔ آپ کے شہر یا گاؤں میں یوم آزادی کے سلسلے ہونے والی کسی تقریب یا پریڈ وغیرہ میں آپ حصہ لیتے ہیں؟

۷۔ کیا آپ اس دن خداوند تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے آپ کو ایک آزاد اسلامی ملک میں پیدا کیا؟

۸۔ کیا آپ اس روز نماز میں خدا سے اپنے وطن کی سلامتی اور اس کی ترقی کے لئے خاص طور پر دعائیں مانگتے ہیں؟

۹۔ کیا آپ اس دن ان شہیدوں اور راہنماؤں کی روحوں کو ایصال ثواب کے لئے جنہوں نے قیام پاکستان کے لئے قربانیاں دیں، فاتحہ پڑھتے ہیں؟

۱۰۔ کیا آپ اس روز خاص طور پر کوئی ایک نیک کام ایسا انجام دیتے ہیں جس سے اس ملک کو یا اس کے شہریوں کو کوئی فائدہ پہنچے۔ مثلاً محلے کی صفائی، دیواروں پر لکھے نعروں کو مٹانا یا کسی کی کوئی مدد کرنا وغیرہ۔

۱۱۔ کیا آپ یوم آزادی کے موقع پر خدا سے یہ عہد کرتے ہیں کہ آپ بڑے ہو کر اس ملک کی خدمت کریں گے؟

۱۲۔ کیا راستہ چلتے ہوئے آپ کو قومی پرچم کی جھنڈیاں زمین پر پڑی نظر آئیں تو انہیں اٹھا لیتے ہیں۔ ؟

۱۳۔ کیا آپ رات ہوتے ہی چھت پر سے قومی پرچم اتار لیتے ہیں؟

۱۴۔ کیا آپ اس دن کسی سے لڑنے جھگڑنے، دنگا فساد کرنے، کسی کو برا بھلا کہنے، غیبت کرنے، کسی کی شکایت کرنے سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں؟

۱۵۔ کیا قومی نغمہ سن کر آپ کا دل وطن کی محبت سے سرشار ہوجاتا ہے؟

۱۶۔ ریڈیو یا ٹیلی وژن سے قومی ترانہ سن کر اگر آپ بیٹھے یا لیٹے ہوں تو کھڑے ہوجاتے ہیں؟

۱۷۔ کیا اس دن آپ فلمی گانے سننے یا فضول کاموں میں اپنا وقت ضائع کرنے سے گریز کرتے ہیں؟

۱۸۔ کیا آپ اس روز پچھلے ایک سال کا جائزہ لیتے ہیں اور یہ یاد کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ آپ کی کن باتوں اور کاموں سے اس ملک کو نقصان پہنچا؟ (مثلاً آپ نے کوئی قانون تو نہیں توڑا؟ کسی سرکاری چیز کو نقصان تو نہیں پہنچایا؟ اسکول یا گھر کے نظم و ضبط کی خلاف ورزی تو نہیں کی؟ اسلحہ یا خطرناک چیزیں حاصل کرنے یا استعمال کرنے کی کوشش تو نہیں کی؟ ایسے دوست تو نہیں بنائے جو اس قسم کی سرگرمیوں میں ملوث ہوں؟)

۱۹۔ آپ جانتے ہیں کہ پاکستان ہم سب کی کوششوں سے بنا ہے۔ تو کیا آپ اس دن یہ بھی سوچتے ہیں کہ اگر اس ملک کو قائم رہنا ہے تو اب بھی ہمیں متحد رہنا چاہئے اور پنجابی، مہاجر، پٹھان، بلوچ اور سندھی بننے کے بجائے صرف مسلمان اور پاکستانی بننا چاہئے۔

۲۰۔ یوم آزادی کے اگلے دن کیا آپ کو یاد رہتا ہے کہ پچھلا دن کیسا گزرا تھا۔ اور آپ نے کیا کچھ سوچا اور عہد کیا تھا۔ ؟

زبان دراز کیسا

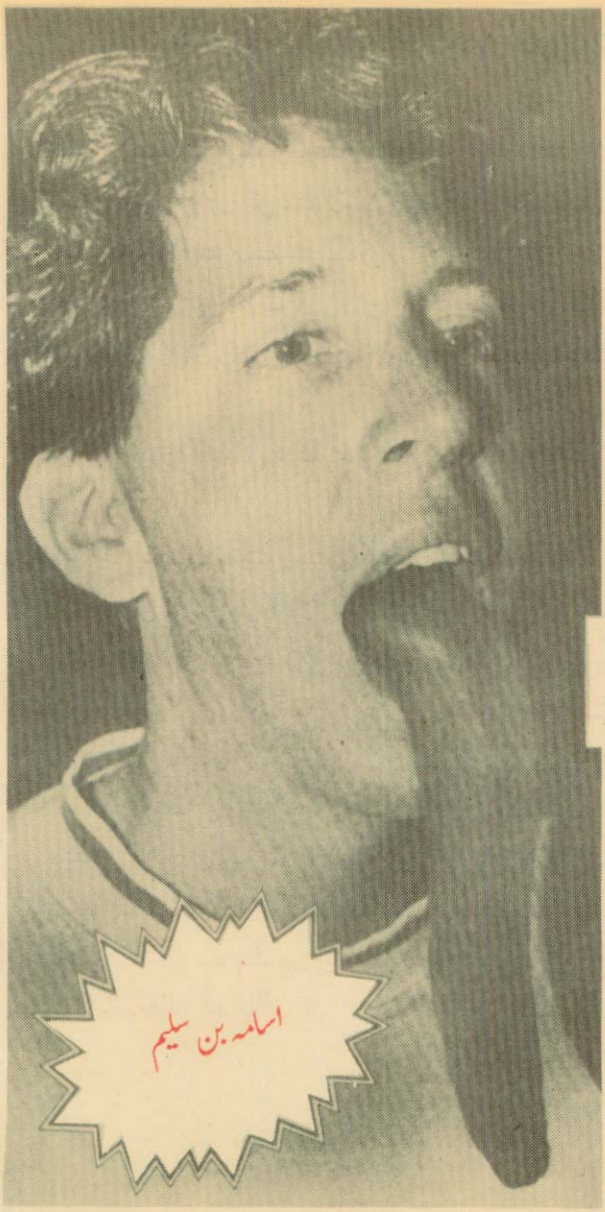

ہماری دنیا ناقابل یقین اور حیرت انگیز واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ ہمارے اطراف آئے دنوں ایسے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ جن کے

متعلق جان کر عقل حیران رہ جاتی ہے۔

یہاں ہم آپ کو ایسا ہی ایک عجیب و غریب واقعہ بتا رہے ہیں، جس کو پڑھ کر آپ بھی حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

فلوریڈا (امریکہ) میں یہ واقعہ وہاں کے ۲۸ سالہ باشندے ہیلیس ہوف کے ساتھ پیش آیا۔ ہوف کی زبان ۲ ماہ کے مختصر عرصے میں ۸ انچ لمبی ہوگئی جبکہ زبان کے بڑھنے کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔ ہوف بے چارہ نہ ٹھیک سے کھا سکتا ہے، نہ پی سکتا ہے، نہ ہی ٹھیک طرح سے بات کر سکتا ہے۔ اس کا منہ ہر وقت کھلا رہتا ہے اور زبان باہر لٹکی رہتی ہے۔ تکلیف اور بے چارگی کے اس عالم میں ڈاکٹر بھی اس کی مدد کرنے سے قاصر ہیں۔

ہوف اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ فلوریڈا کی مضافاتی بستی میں بڑے سکون سے عام انسانوں کی طرح رہ رہا تھا کہ اچانک اسے اس تکلیف دہ صورت حال سے دوچار ہونا پڑا۔ ہیلیس ہوف نے اس کی تفصیلات بیان کرتے کہا کہ "۱۳ اپریل ۱۹۹۱ء کو مجھے نزلے کی شکایت ہوئی۔ نزلے کی حالت میں آرام کرنے کی خاطر میں بستر پر دراز ہوگیا۔ رات کی نیند لے کر صبح جب میں نے اٹھنا چاہا تو محسوس کیا میرے گلے میں تکلیف ہے۔ میرا سر درد سے پھٹا جارہا ہے اور مجھے وقفے وقفے سے چھینکیں بھی آرہی ہیں۔ میں نے یہی سمجھا کہ یہ سب کچھ نزلے کی وجہ سے ہے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں، میں نے محسوس کیا کہ میری زبان قدرے لمبی ہوگئی ہے۔ اس عجیب و غریب صورتحال سے میں پریشان ہوگیا، میں نے فوراً اپنی بیوی کو اپنی

کیفیت سے آگاہ کیا مگر وہ یہ سمجھی کہ شاید میں اس سے مذاق کر رہا ہوں اور چرچ نہ جانے کی خاطر یہ سب کچھ کہہ رہا ہوں۔ میری زبان ۴ انچ بڑھ چکی تھی۔ مجھے فوری طور پر قریبی ہسپتال لے جایا گیا جہاں میں تین دن تک داخل رہا۔ ان تین دنوں میں بھاری فیس وصول کرنے والے بڑے بڑے ڈاکٹر آتے رہے اور میرے لئے مختلف نوعیت کے ٹیسٹ بھی لکھ کر دیتے رہے مگر کسی ٹیسٹ سے بھی کئی خاص بات معلوم نہ ہو سکی۔ آخر کار ڈاکٹروں نے اسے "الرجی" قرار دے دیا۔ ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ 'پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے لیکن آخر کار تم ٹھیک ہو جاؤ گے'۔ مگر میں کب ٹھیک ہوں گا؟ اس وقت تک میری زبان ۸ انچ بڑھ چکی ہے اور اس کے بڑھنے کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے میں اپنی لمبی زبان کی وجہ سے بالکل بیوقوف نظر آتا ہوں اور لوگوں نے بھی میرا نام "مسٹر لیزرڈ" (مسٹر چھپکلی) رکھ دیا ہے۔"

ہیلیس ہوف جو ایک مقامی انشورنس کمپنی میں سیلز مین ہیں۔ اس صورتحال سے بہت پریشان ہیں۔ ان کی پریشانی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لوگ ہوف سے بیمہ پالیسی بھی نہیں لے رہے اور اس کا بزنس ٹھپ ہو کر رہ گیا ہے۔ ہوف کے دو بیٹے ہیں۔ اس کے دونوں بچے اور بیوی اس کا بہت خیال رکھتے ہیں مگر پریشان تو وہ بھی ہیں۔ ہوف کا کہنا ہے کہ کیا کوئی ایسا شخص ہے جو اسے اس پریشانی سے نجات دلا سکے؟؟

قلم اٹھائیے

مادرِ وطن کا قرض چکائیے

ماہِ ستمبر دفاعِ وطن سے تعبیر ہے

ستمبر ۱۹۶۵ء میں پاکستان کے جیالے شہریوں اور بہادر افواج نے وطنِ عزیز کا دفاع کرتے ہوئے شجاعت اور بہادری کی تاریخ رقم کی، آزادی کی آن پر مَر مٹنے والوں نے اس کی حرمت پر حرف نہ آنے دیا۔

ستمبر کی خصوصی اشاعت

کے لیے ایسی کہانیاں اور مضامین لکھئے جن کا مقصد شہدا کو خراجِ تحسین پیش کرنا، غازیوں کو سلامِ عقیدت پہنچانا اور دلوں میں آزادی کی جوت جگانا ہو۔

ہم آپ کی تحریروں کے منتظر ہیں۔

نوٹ: آپ کی تحریریں ۱۰؍اگست تک لازماً موصول ہوجانی چاہئیں

پتہ: تحریر حُبِّ وطن
ماہنامہ آنکھ مچولی ۱۱۲ ڈی سائٹ کراچی

ہے دیکھنے کی چیز اِسے بار بار دیکھ

کیا یہ دونوں حضرات شطرنج کھیل رہے ہیں؟ جی نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ یہ انہونے اور غیر یقینی
واقعات کی ایسی تصویر ہے جسے مصوّر نے ایک دلچسپ معمّہ بنا دیا ہے
آپ بھی غور سے دیکھئے اور بتلایئے کہ اس تصویر میں کہاں کہاں اور کیا کیا غلطیاں ہیں؟

ایک جج آئیڈیل

محمد طاہر اختر

حضرت عمرؓ کا دورِ خلافت ہے۔ آپؓ کسی سے گھوڑا خریدتے ہیں۔ اس شرط پر کہ اگر پسند آگیا تو رکھ لیں گے ورنہ واپس کر دیں گے۔ گھوڑا ایک سوار کو دیتے ہیں تاکہ وہ جانچ سکے۔ سواری کے دوران گھوڑا چوٹ کھا کر لنگڑا ہو جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ گھوڑا واپس کر دینا چاہتے ہیں مگر مالک لینے سے انکار کر دیتا ہے۔ دونوں شریح بن حارث (وفات ۷۹ھ) کو ثالث مقرر کرتے ہیں۔ شریح اپنا فیصلہ سناتے ہیں "جو گھوڑا خریدا ہے اسے رکھو یا جس حالت میں لیا تھا اسی حالت میں واپس کرو۔" آپؓ فیصلہ ہی تسلیم نہیں کرتے بلکہ شریح کو کوفہ کا جج مقرر کر دیتے ہیں کہ ایسا دور اندیش، ذہین، حدیث و فقہ کا ماہر اور بے خوف شخص ایسے ہی منصب کا اہل ہو سکتا ہے۔

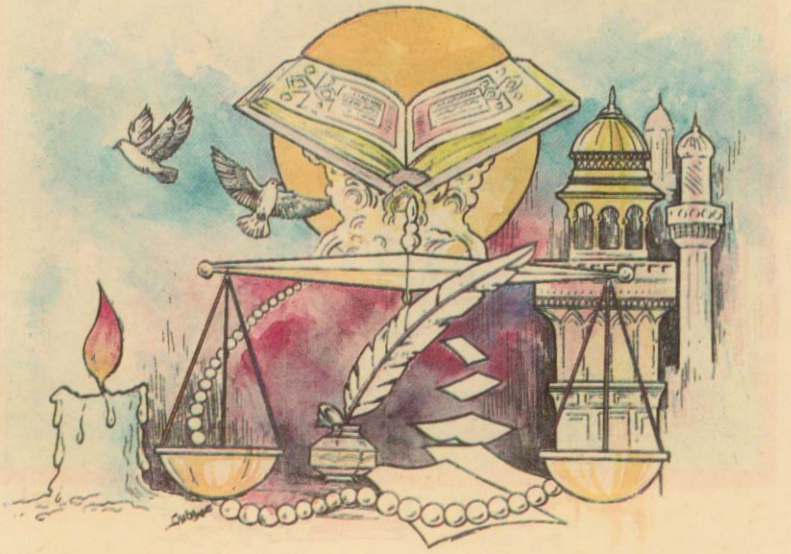

شریح اپنے عہدہ کی ذمہ داریوں کو اس احسن طریقے سے انجام دیتے ہیں کہ عبدالملک کے زمانے تک مسلسل ساٹھ برس اس عہدہ پر فائز رہتے ہیں۔ اسلام کی تاریخ میں ان کا شمار سب سے بڑے ججوں میں ہوتا ہے۔ ان کے بعض فیصلوں پر تو اسلام کی تاریخ عدل بجا طور پر ناز کر سکتی ہے۔

(۲)

حضرت علیؓ کا دورِ خلافت ہے۔ دارالخلافہ مدینے سے کوفہ منتقل ہو چکا ہے۔ شریح اسلامی مملکت کے چیف جسٹس ہیں۔ امیرالمومنین اور ایک یہودی کا جھگڑا ان کی عدالت میں پیش ہوتا ہے۔ امیرالمومنین کی زرہ کہیں گر گئی تھی اور اس یہودی کے ہاتھ لگ گئی۔ آپ کو معلوم ہوتا ہے تو اس سے زرہ کی واپسی کا مطالبہ کرتے ہیں مگر یہودی زرہ کو اپنا بتاتے ہوئے دینے سے انکار کر دیتا ہے۔ امیرالمومنین عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں چیف جسٹس شریح فریقین کے بیان لیتے ہیں۔ یہودی اپنے بیان میں کہتا ہے زرہ میری ہے اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ یہ میرے قبضے میں ہے۔ شریح، امیرالمومنین سے اپنے دعوے کے ثبوت کے لئے دو گواہ پیش کرنے کو کہتے ہیں۔ وہ دو گواہ پیش کرتے ہیں حسنؓ اور قنبرؓ۔ شریح کہتے ہیں، "قنبرؓ کی شہادت تو قابلِ قبول ہے لیکن حسنؓ کی نہیں۔" امیرالمومنین کہتے ہیں "آپ حسنؓ کی شہادت کو مسترد کر رہے ہیں! کیا آپؓ نے رسول اللہؐ کا ارشاد نہیں سنا کہ حسنؓ اور حسینؓ جنتی نوجوانوں کے سردار ہیں۔" شریح کہتے ہیں۔ "سنا ہے مگر میرے نزدیک باپ کے حق میں بیٹے کی شہادت قبول نہیں کی جا سکتی۔"

دوسرا گواہ نہ ہونے کی وجہ سے حضرت علیؓ کا دعویٰ خارج کر دیا جاتا ہے۔ امیرالمومنین اس فیصلے کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں۔

یہودی اس فیصلے سے بہت متاثر ہوتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے ایک شخص صاحبِ اقتدار ہونے کے باوجود زرہ اس سے نہیں چھینتا بلکہ عدالت کے دروازے پر دستک دیتا ہے اور مدعی کی حیثیت سے اس کے سامنے جاتا ہے پھر عدالت اس کے ساتھ کوئی امتیازی برتاؤ نہیں کرتی بلکہ مدعی اور مدعا علیہ دونوں یکساں حالت میں اس کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ عدالتی کارروائی میں بھی کوئی خاص اہتمام نہیں۔ روزمرہ کی سی کارروائی ہوتی ہے اور عدالتی طریق کار کے عین مطابق اور پھر عدالت کا جج امیرالمومنین کے خلاف فیصلہ سناتا ہے اور امیرالمومنین بھی اس کو قبول کرتے ہیں۔ اسلامی عدالت کا عدل اور امیرالمومنین کا کردار اس کے دل میں کھب جاتا ہے وہ وہیں عدالت میں پکار اٹھتا ہے کہ زرہ امیرالمومنین ہی کی ہے اور جس دین کا ماننے والا قاضی، امیرالمومنین کے خلاف فیصلہ سنا سکتا ہے اور امیرالمومنین اس فیصلے کو تسلیم کر لیتے ہیں، وہ یقیناً سچا ہے۔

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ۔

عدل کا ایک منظر اور دیکھئے

عدالت کا اجلاس ہو رہا ہے۔ اپنے عہد کے بلند پایہ عالم اشعث بن قیس تشریف لاتے ہیں شریح اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور کہتے ہیں ہمارے شیخ اور سردار خوش آمدید! پھر انہیں اپنے پہلو میں بٹھا لیتے ہیں اتنے میں ایک شخص داخل ہوتا ہے، وضع قطع اور لباس وغیرہ سے کوئی عامی معلوم ہوتا ہے۔ وہ اشعث کے خلاف دعویٰ دائر کرتا ہے اور عدالت سے انصاف کا طلب گار ہے۔ شریح اس کا بیان لیتے ہیں اور سارا واقعہ سنتے ہی ان کی نگاہیں بدل جاتی ہیں۔ وہ اشعث کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"اشعث! یہاں سے اٹھ کر مدعی کے پاس کھڑے ہو جاؤ اور جواب دعویٰ پیش کرو۔" اشعث جسٹس شریح کے اس طرز عمل پر چونک پڑتے ہیں اور کہتے ہیں "میں یہیں بیٹھ کر ان باتوں کا جواب دوں گا۔" جسٹس شریح کی باوقار اور بلند آواز عدالت میں گونجتی ہے۔ "فوراً کھڑے ہو جاؤ ورنہ میں کسی کو حکم دوں گا کہ وہ تمہیں اٹھا دے۔" عدالت میں سناٹا طاری ہو جاتا ہے اشعث چپ چاپ اٹھتے ہیں اور مدعی کے ساتھ کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ایک مرتبہ ان کے صاحب زادے کا چند دوسرے اشخاص سے کسی حق کے بارے میں جھگڑا ہو جاتا ہے لڑکا انہیں سارے واقعات بتا کر پوچھتا ہے اگر مقدمے میں کامیابی کی امید ہو تو میں دعویٰ کر دوں ورنہ خاموش رہوں۔ شریح مشورہ دیتے ہیں مقدمہ دائر کر دو۔ مقدمہ انہیں کے سامنے پیش ہوتا ہے۔ اور وہ لڑکے کے خلاف فیصلہ دیتے ہیں گھر آتے ہیں تو لڑکا کہتا ہے۔ میں نے آپ سے مشورہ نہ کر لیا ہوتا تو مجھے شکایت نہ ہوتی مگر آپ نے خود ہی مقدمہ دائر کرنے کا مشورہ دیا اور خود ہی میرے خلاف فیصلہ کر دیا۔ اس طرح مجھے ذلیل رسوا کیا۔ شریح کا جواب تاریخ میں سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے کہتے ہیں۔

"جان پدر! تم مجھے دنیا جہان سے عزیز ہو، لیکن اللہ مجھے عزیز تر ہے۔ مجھے ان لوگوں کا حق نظر آیا تھا اگر میں تمہیں بتا دیتا۔ تو تم ان سے صلح کر لیتے اور ان کا حق مارا جاتا۔"

کسی بھی جج کو بہت سی باتیں عدل و انصاف کی راہ سے ہٹا سکتی ہیں۔ اعلیٰ حکام کا دباؤ، ان کا لحاظ، عزیز و اقارب کا خیال، سفارش، رشوت اور سماجی مرتبہ وغیرہ۔ تو شریح ہمیں ان تمام سے پاک نظر آتے ہیں۔

رشوت بھی حق و عدل کی راہ میں ہر زمانے میں رکاوٹ رہی ہے۔ اور اس کی مہذب ترین شکل تحفے تحائف ہیں۔ شریح کے پاس بھی ہدیہ و تحائف آتے ہیں۔ وہ قبول تو کر لیتے ہیں مگر رشوت سے بچنے

کے لئے اپنی طرف سے ہدیہ دے دیتے ہیں۔

جج اور قاضی بعض اوقات ظاہری فریب میں آجاتے ہیں مگر شریح نہایت دور اندیش ہیں اور اہل مقدمہ کی ظاہری حالت سے کبھی متاثر نہیں ہوتے۔ ایک عورت ایک مرد کے خلاف مقدمہ دائر کرتی ہے۔ امام شعبیؒ بھی موجود ہیں۔ شریح سے کہتے ہیں یہ عورت مظلوم معلوم ہوتی ہے۔ شریح فرماتے ہیں رونا مظلومیت کا ثبوت نہیں، یوسف کے بھائی بھی اپنے باپ کے پاس روتے ہوئے آئے تھے۔

الغرض شریح مقدمے کی گہرائیوں میں اترتے ہیں اور شہادتوں کو خوب جانچتے ہیں۔ تاہم مقدمے کا انحصار شہادتوں پر ہوتا ہے۔ اس لئے جب دیکھتے ہیں کہ گواہ مشکوک ہیں اور ان کی ظاہری صداقت پر گرفت نہیں کی جاسکتی تو گواہوں سے کہتے ہیں میں نے تمہیں طلب نہیں کیا۔ تم جانا چاہتے ہو تو میں نہیں روکتا۔ تمہاری گواہی سے میرا دامن محفوظ ہو جائے گا تم بھی اپنے آپ کو بچاؤ۔ اگر گواہ پھر بھی جھوٹی گواہی سے باز نہ آئے تو مجبوراً اس کی شہادت پر فیصلہ کر دیتے ہیں اور جس فریق کے حق میں فیصلہ سناتے ہیں اس سے کہہ دیتے ہیں کہ "تم اسی معاملے میں ظالم ہو لیکن مقدمے کا فیصلہ مجھے ثبوت کے مطابق کرنا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ ہے کہ جو چیز خدا نے تم پر حرام کی ہے میرا فیصلہ اسے حلال نہیں کر سکتا۔"

ابو عبداللہ مکحولؒ دشقی فرماتے ہیں۔

"میں چھ ماہ تک شریح کی عدالت میں معلومات حاصل کرنے کے لئے جاتا رہا۔ میں ان سے کچھ نہ پوچھتا تھا۔ ان کے فیصلے میرے معلومات کے لئے کافی ہوتے تھے۔"

انتخاب

شیراز حسین

- ..... اللہ کا خوف حکمت کا پہلا زینہ ہے۔ (الحدیث)
- ..... حوصلہ اور وقار اللہ کی پسندیدہ عادتیں ہیں۔ (الحدیث)
- ..... ساری عبادت کا نچوڑ دعا ہے۔ (الحدیث)
- ..... دینی امور پر جھگڑا کرنے سے احتراز کرو۔ (الحدیث)
- ..... جنت تلواروں کے سایہ میں ہے۔ (الحدیث)
- ..... تمام اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔ (الحدیث)
- ..... بندے اور کفر کا درمیانی فاصلہ ترکِ نماز ہے۔ (الحدیث)
- ..... حیا ایمان کی علامت ہے۔ (الحدیث)
- ..... جب حیا نہ ہو تو جو جی میں آئے کرو۔ (الحدیث)
- ..... انسان اسی کا ساتھی ہوگا جس سے وہ محبت کرے۔ (الحدیث)

دن کا نام بتائیے

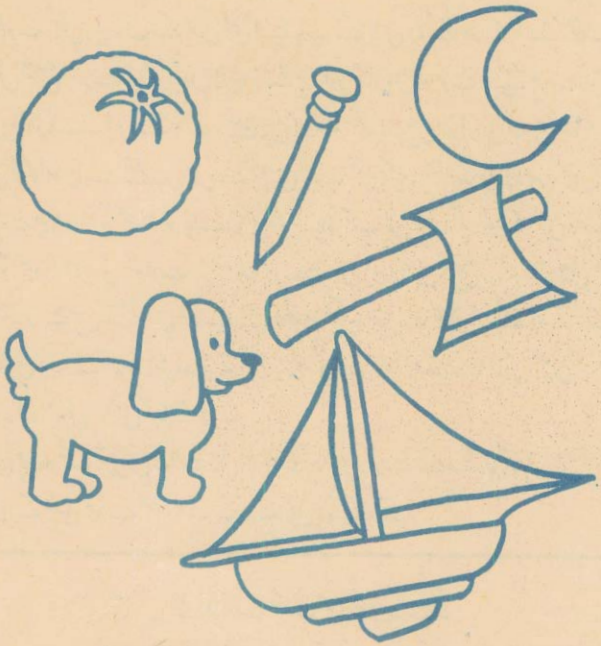

ان تمام چیزوں کے انگریزی ناموں کا پہلا حرف چھے خانوں میں اس طرح لکھتے چلے جائیے کہ ہفتے کے سات دنوں میں سے کسی ایک دن کا نام بن جائے۔

معصوم

مرکزی خیال ماخوذ

منیر احمد راشد

کشمیر کی تحریک آزادی اپنے عروج پر تھی۔ دونوں طرف جذبات کی شدت اب جنون کا رنگ اختیار کر گئی تھی۔ حریت پسندوں نے کفن سر پر باندھ کر بھارتی فوجیوں کو سرِعام للکارنا شروع کر دیا۔ وہ اکا دکا فوجی یا پورے کاروان کا خیال کئے بغیر ان سے بھڑ جاتے۔ تعداد کا تو خیر انہوں نے شروع سے کبھی خیال نہیں رکھا تھا، مگر اب عالم یہ تھا کہ دو دو چار چار کی ٹولی پوری پلاٹون سے ٹکرا جاتی اور اکثر و بیشتر اسے کافی نقصان پہنچاتی۔ ہندو فوجیوں نے بھی اپنی کارروائیاں تیز تر کر دی تھیں۔ گاؤں کے گاؤں جلانا، بوڑھے بچے کا خیال کئے بغیر گولیوں سے بھون دینا، عورتوں کی عصمت دری کرنا تو شروع سے ان کا معمول تھا۔

بھاری توپ خانہ اور ٹینک بھی وہ بہت پہلے سے استعمال کر رہے تھے۔ اب انہوں نے ہیلی کاپٹر اور بمبار طیارے بھی استعمال کرنا شروع کر دیئے تھے۔ کشمیر کے تقریباً تمام بڑے شہر انسانی آبادی سے خالی ہو چکے تھے۔ لوگ اپنے گھروں کو خیرباد کہہ کر یا تو پاکستان ہجرت کر گئے تھے یا پھر دور دراز کے چھوٹے موٹے گاؤں اور محفوظ پہاڑوں پر جا بسے تھے۔ جنّت نظیر وادی کشمیر مکمل طور پر میدان جنگ بن چکی تھی جہاں حریت پسندوں اور بھارتی فوجیوں کو اپنا زور آزمانے کی بھرپور آزادی حاصل تھی۔

پانچ سالہ راہول کو بھی ایک ماہ پہلے اس کی والدہ نے دادی کے پاس بھیج دیا تھا۔ جو ایک دور دراز سرحدی گاؤں میں رہتی تھی۔ راہول کا اصل گھر بارہ مولا میں تھا۔ اس کا باپ فوجی تھا۔ اپنی ڈیوٹی کے سلسلے میں وہ اکثر گھر سے باہر رہتا تھا۔ ماں کے ساتھ راہول تنہا رہتا تھا۔ جب حالات زیادہ خراب ہو گئے تو ماں نے راہول کو چچا کے ساتھ دادی کے پاس بھیج دیا۔ خود وہ اپنے شوہر کے ساتھ آنا چاہتی تھی۔ یہاں آنے کے بعد راہول ہر روز اس کا انتظار کرتا تھا۔

راہول چونکہ اکیلا تھا اس لئے اسے عجیب عجیب کہانیاں سوچنے کی عادت ہو گئی تھی۔ اس وقت بھی وہ گائے کی کھرلی کے نیچے چھپا ہوا تھا اور جن بھوتوں کے مزے دار کہانیاں سوچ رہا تھا کہ اسے دادی کی آواز سنائی دی۔ وہ اسے سونے کے لئے بلا رہی تھیں۔ راہول کو دوپہر میں سونے کی عادت نہیں تھی مگر دادی زبردستی اسے بستر پر لٹا دیتی تھی۔ راہول دم سادھے وہیں پڑا رہا۔ اسے معلوم تھا کہ تھوڑی دیر میں دادی اسے ڈھونڈتی ہوئی وہاں آجائے گی اور پھر اس کا منہ ہاتھ دھلا کر سلا دے گی۔ ایسا ہی ہوا۔ چند منٹ کے بعد دادی نے اسے کھرلی کے نیچے سے ڈھونڈ نکالا۔ وہ بولی، "چلو نکلو باہر۔ ورنہ یہیں باندھ دوں گی گائے کے ساتھ۔"

راہول چپ چاپ باہر نکل آیا۔ دادی نے ہلکے سے اس کے کان مروڑے اور کہا،

"بہت شرارتی ہو گئے ہو تم ..... ہر وقت کہیں نہ کہیں چھپے رہتے ہو۔ اب اگر میں تلاش نہ کر لیتی تو نجانے کب تک مجھے تنگ کرتے۔" راہول بدستور چپ تھا۔ دادی نے حوض پر لے جا کر خوب رگڑ رگڑ کر اس کا منہ ہاتھ دھلایا اور اسے بستر پر لٹا دیا۔

بستر پر لیٹے ہوئے راہول نے خود کو مخاطب کیا۔ "ہاں تو میں گولو جن کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ گولو جن جو چھوٹا سا تھا۔ گول مٹول۔ اس کے چھوٹے چھوٹے کان تھے۔ دو چھوٹے سے سینگ اور دو آنکھ ..... نہیں بھئی دو آنکھ سے مزا نہیں آئے گا۔ چلو تین آنکھیں تھیں۔ گول گول گولو جن بہت شرارتی تھا۔ ہر وقت امی کو تنگ کرتا رہتا تھا۔ ایک دن اس کی امی نے تنگ آ کر اسے دادی کے پاس بھیج دیا ..... جیسے مجھے امی نے یہاں بھیج دیا ..... مگر میں تو شرارتی نہیں ہوں۔ اور

امی نے مجھے تنگ آکر بھی نہیں بھیجا..... وہ تو جنگ کی وجہ سے بھیجا تھا۔" ماں کو یاد کر کے راہول کا دل بھر آیا۔ اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ سوچنے لگا۔ "یہ جنگ کیوں ہوتی ہے۔ کیوں لوگ ایک دوسرے کو مارتے ہیں۔ خوا مخواہ....." پھر وہ امی اور اس کے لاڈ کو یاد کرتے کرتے سو گیا۔

شام کو جب اس کی آنکھ کھلی تو دادی گائے کے لئے چارہ کھرلی میں ڈال رہی تھی۔ اس کے ہاتھ سبز اور خشک چارے کے ملغوبے سے آلودہ تھے۔ بال بکھرے ہوئے اور شلوار پنڈلیوں تک اوپر کی ہوئی۔ دوپٹہ اس وقت گلے میں نہیں تھا۔ دادی کے سفید جھاڑ بال اس کے جھریوں بھرے چہرے پر عجیب وحشت ناک لگ رہے تھے۔ راہول نے پلنگ پر لیٹے لیٹے سوچا۔ "دادی ایک جادوگرنی ہے۔ اس نے جادو کے زور سے ایک شہزادی کو گائے بنا دیا ہے۔ اور اب اسے جادو کا چارہ کھلا رہی ہے تاکہ وہ ساری عمر گائے ہی بنے رہے۔ میں ملک بھارت کا شہزادہ ہوں اور شہزادی کو آزاد کرانے کے لئے آیا ہوں ..... ضرور اس جادوگرنی کی جان کسی طوطے میں ہوگی ..... مجھے پہلے طوطا تلاش کرنا چاہئے ..... چلو فرض کیا میں نے یہ طوطا پکڑ لیا" ..... اس نے اپنا جوتا ہاتھ میں پکڑتے ہوئے سوچا..... "اب میں چپکے سے اس کی گردن مروڑ دوں گا..... اے یوں ..... ہاں ..... اب جادوگرنی ایک چیخ مارے گی..... اور زمین پر گر کر تڑپنے لگے گی..... جادو کا اثر ختم ہوتے ہی یہ محل تباہ ہو جائے گا۔" ..... اس نے دادی کے کچے مکان پر ایک نظر ڈالی..... "گائے شہزادی بن جائے گی اور بڑے زور کا زلزلہ آئے گا..... سارے پہاڑ ہل جائیں گے ..... خوب شور ہوگا۔" اور سچ مچ یک دم تیز شور کی آواز پیدا ہوئی..... راہول خوفزدہ ہو کر چارپائی کے نیچے گھس گیا..... جوتا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا تھا..... یہ شور کسی زلزلے کا نہیں تھا بلکہ برابر والے گاؤں میں ہونے والے دھماکوں کا تھا۔ لگتا تھا حریت پسندوں نے پھر کسی فوجی چھاؤنی یا قافلے پر حملہ کیا تھا۔ اصل صورت حال سے واقف ہوتے ہی راہول پلنگ کے نیچے سے نکل آیا اور مکان کی چھت پر چڑھ گیا۔ چھت پر آنا بھی اس کا روز کا معمول تھا۔ یہاں بھی اس نے چھپنے کے چند ٹھکانے ڈھونڈ رکھے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ جب دادی کو کھرلی والے ٹھکانے کا پتہ چل جائے گا تو وہ دو چھتی پر چھپ جایا کرے گا۔ جہاں گھر کا پرانا کاٹھ کباڑ پڑا رہتا تھا۔

یہاں ایک آدمی کے چھپنے کے لئے خاصی جگہ تھی۔ بلکہ آج صبح ہی اس نے ایک اور شاندار جگہ تلاش کی تھی۔ یہ مکان کی چھت پر بنی ہوئی چمنی اور اس کے ساتھ اگے ہوئے پیڑ کے درخت کی ایک موٹی شاخ کی وجہ سے بن گئی تھی۔ مگر وہاں پہنچنے کے لئے خاصی محنت کی ضرورت تھی۔ اسے چھت کے

کنارے سے تقریباً لٹک کر وہاں تک پہنچنا تھا۔ اور اگر ذرا بھی ہاتھ پھسلتا تو وہ لڑھکتا ہوا نیچے بہتے ہوئے پانی کے برساتی نالے میں جا گرتا۔ اسی خوف کی وجہ سے اس نے ابھی تک وہاں چھپنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

چھت پر کھڑے کھڑے غیر ارادی طور پر اس کی نظر اپنی آئندہ پناہ گاہ کی طرف اٹھ گئی۔ اس نے چاہا کہ ایک دو منٹ کے لئے دو چھتی پر لیٹ کر ہی دیکھ لیا جائے۔ مگر دادی نے اسے نیچے آنے کے لئے کہا۔ اور وہ چپ چاپ نیچے اتر گیا۔

اگلی صبح جب ناشتے کے بعد دادی چشمے سے پانی لینے چلی گئی تو راہول نے سوچا کہ چل کر دو چھتی میں چھپنے کی جگہ کا معائنہ کیا جائے۔ وہ جلدی سے وہاں پہنچا مگر جیسے ہی اس نے دو چھتی پر قدم رکھا اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ وہاں ایک کشمیری جوان لیٹا ہوا تھا۔ جو شاید زخمی بھی تھا۔ اس کی آہٹ سے کشمیری کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے فوراً جیب میں ہاتھ ڈالا۔ راہول سمجھا کہ وہ اب پستول نکال لے گا اور اسے گولی مار دے گا۔ خوف کی وجہ سے اس کے دونوں ہاتھ خود بخود کندھوں سے اوپر اٹھ گئے۔ مگر جب کشمیری نوجوان نے ہاتھ جیب سے نکالا تو اس میں پستول کے بجائے چیونگم تھی۔ اس نے مسکرا کر راہول کی طرف دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر چیونگم کی پیش کش کی۔ راہول اب زیادہ خوفزدہ نہیں تھا۔ پھر بھی وہ ہچکچا رہا تھا۔ کشمیری جوان نے تھوڑی سی چیونگم اپنے دانتوں سے کاٹی اور باقی راہول کی طرف بڑھا دی جو اس نے لے لی۔ وہ کشمیری جوان کے قریب بیٹھ گیا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ کشمیری جوان نے بتایا کہ اس کا نام انور ہے اس کا بھی ایک چھوٹا سا بیٹا تھا۔ بالکل راہول جیسا۔ جسے ہندو فوجیوں نے قتل کر دیا تھا۔ راہول کو بڑا دکھ ہوا۔ اس نے پوچھا۔

"تمہارے بیٹے کو فوجیوں نے کیوں مار دیا؟"

"اس لئے کہ وہ مسلمان کا بیٹا تھا۔"

"میں بھی تو ہندو کا بیٹا ہوں۔ تم نے مجھے کیوں نہیں مارا؟"

"مسلمان عورتوں اور بچوں کو قتل نہیں کرتے۔ ان کی لڑائی صرف جوانوں کے ساتھ ہوتی ہے۔" انور نے جواب دیا۔ اسے راہول کی معصومیت پر پیار آرہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بولا۔

"جاؤ تم گھر والوں کو بتا دو کہ میں یہاں چھپا ہوا ہوں۔ تاکہ وہ فوجیوں کو بتا دیں اور وہ مجھے گرفتار کر لیں۔" راہول چپ چاپ وہاں سے اٹھ کر واپس آگیا۔ نیچے دادی باورچی خانے میں کھانا پکا رہی تھی۔ اس نے دادی سے کہا۔

"میں نے ایک کشمیری جوان کو گرفتار کیا ہے۔ آپ فوجیوں کو بلائیں تاکہ وہ اسے لے

جائیں۔ "

"چلو .... آج کوئی جن ہاتھ نہیں آیا تو کشمیری جوان کو پکڑ لیا .... جاؤ جا کر کھیلو باغ میں۔ " دادی نے بے زاری سے کہا۔ راہول مزید کچھ نہ بولا اور واپس چلا آیا۔ البتہ اس نے دادی سے آنکھ بچا کر صبح کا بچا ہوا ایک پراٹھا چنگیری میں سے اٹھا لیا تھا۔ وہ دوبارہ دوچھتی پر آیا اور انور کو وہ پراٹھا دے کر واپس چلا گیا۔ ایک چکر اس نے دوپہر میں بھی دوچھتی کا لگایا تھا۔ اس وقت انور سو رہا تھا۔ راہول نے پانی کا گلاس اور ایک روٹی پر اچار رکھ کر اس کے قریب رکھ دیا تھا تاکہ جب وہ جاگے تو کھالے۔

شام کے وقت جب کہ ابھی سورج اچھی طرح غروب نہیں ہوا تھا۔ ددا رام دیوان کے گھر آیا۔ یہ راہول کی دادی کا پڑوسی تھا۔ اس نے بتایا کہ کل جو دھماکے ہوئے تھے وہ دراصل کشمیری باغیوں کے حملے کی وجہ سے ہوئے تھے۔ سنا ہے چار آدمیوں نے حملہ کیا تھا۔ ہمارے بیس آدمی سوتے میں مارے گئے۔ تین کشمیری بھی مارے گئے مگر چوتھا کہیں بھاگ گیا ہے۔ فوجیوں کو شک ہے کہ وہ یہاں ہمارے گاؤں میں کہیں چھپا ہوا ہے۔ آج گھر گھر تلاشی ہوگی۔ بس تھوڑی دیر میں فوجی آتے ہی ہوں گے۔ گائے کی کھرلی کے پاس بیٹھ کر مٹی سے کھیلتے ہوئے راہول نے بھی یہ باتیں سنیں وہ فوراً دوچھتی پر پہنچ گیا اور انور کو آنے والے خطرے سے آگاہ کیا۔ انور نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

"ٹھیک ہے راہول .... میں کوشش کرتا ہوں کہ فوجیوں کے آنے سے پہلے ہی یہاں سے بھاگ جاؤں۔ "

"لیکن تم جاؤ گے کہاں۔ ہر طرف تو فوجی ہی فوجی ہیں۔ "

"تو کیا کروں۔ یہاں چوہے دان میں پکڑے جانے سے بہتر ہے کہ میدان میں مقابلے میں ملا جاؤں۔ "

"میں تمہیں چھپنے کی ایک جگہ بتا سکتا ہوں۔ " راہول نے اس کی بات سنی ان سنی کر کے کہا۔

"میرا خیال ہے وہ بہترین جگہ ہے۔ تمہیں کوئی بھی وہاں تلاش نہیں کر سکے گا۔ " راہول نے چمنی والی جگہ کی طرف اشارہ کیا۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ فوجیوں کی ایک ٹولی ان کے گھر پہنچ گئی۔ دادی نے آہستگی کے ساتھ راہول سے پوچھا۔

"صبح تم کسی کشمیری جوان کا ذکر کر رہے تھے۔"

"میں تو مذاق کر رہا تھا۔" راہول نے معصومیت سے کہا۔ دادی نے اسے گھور کر دیکھا۔ بولی۔ "آئندہ ایسا مذاق نہیں کرنا۔"

فوجی افسر جو بالکل دروازے پر پہنچ چکا تھا۔ دادی سے کسی مفرور کشمیری کے بارے میں پوچھنے لگا۔ پھر بہت سے فوجی گھر میں داخل ہوگئے۔ وہ گھر کی ایک ایک چیز کی تلاشی لینا چاہتے تھے۔ راہول خوفزدہ ہو کر ایک بار پھر کھرلی کے نیچے چھپ گیا۔ اس نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ فوجی اس کے سامنے انور کو پکڑ کر لے جائیں۔

کھرلی کے نیچے لیٹے لیٹے اس نے سوچا کہ یہ کھرلی دراصل جادو کا قالین ہے۔ جسے پکڑ کر وہ ہواؤں میں اڑ رہا ہے۔ اور پھر آہستہ آہستہ وہ پہاڑوں کے اوپر سے ہوتا ہوا بارہ مولا پہنچ گیا۔ پھر اسے اپنا گھر بھی نظر آگیا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ گھر میں اترتا۔ دادی نے اس کی ٹانگ کھینچ لی۔ "ٹائم بے ٹائم تو دیکھا کر۔ ہر وقت یہاں گھسا رہتا ہے۔" دادی نے غصے سے کہا۔

فوجی واپس چلے گئے تھے اور انہیں انور نہیں ملا تھا۔ یہ جان کر راہول کو عجیب سی خوشی ہوئی۔ وہ دادی کے ساتھ کمرے میں گیا اور کافی دیر کروٹیں بدلنے کے بعد بالآخر اسے نیند آہی گئی۔

صبح اٹھتے ہی راہول سب سے پہلے چھت پر گیا تھا۔ مگر انور وہاں نہیں تھا۔ وہ تو شاید رات ہی کو کسی طرف نکل گیا تھا۔ اب راہول کو ایک نیا کھیل ہاتھ آگیا تھا۔ وہ دو چھتی میں جا کر چھپ گیا اور سوچنے لگا جیسے وہ ایک کشمیری جوان ہے، اور دادی بھارتی فوجی۔ وہ فوجیوں سے جان چھپا کر یہاں لیٹا ہوا ہے اور فوجی اسے تلاش کرتے پھر رہے ہیں، اس نے دادی کی آواز سنی جو اسے ناشتے کے لئے بلا رہی تھی۔ مگر وہ دم سادھے پڑا رہا۔ جیسے وہ سچ مچ کوئی مفرور قیدی ہے۔

اُلٹی کیل

ایک صاحب دیوار میں کیل ٹھونک رہے تھے، بہت دیر سے کوشش میں مصروف تھے۔ لیکن ہر بار ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا۔

اتفاق سے ان کے شناسا آگئے۔ انہوں نے دیکھا کہ ان کا دوست دیوار میں الٹی کیل ٹھونک رہا ہے تو انہوں نے جھٹ سے اس کے ہاتھ سے کیل لی اور بولے "یہ کیل اس دیوار کی نہیں سامنے والی دیوار کی ہے۔

مرسلہ۔ محمد فراز اعوان ..... جیکب آباد

پلاسٹک کا زمانہ

سیّد طارق محمود

آپ نے یقیناً سنا ہو گا کہ آج سے ہزاروں سال پہلے پتھر کا زمانہ تھا۔ کیا آپ اس بات کا مطلب جانتے ہیں؟۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ اس دور میں روز مرہ کے استعمال کی بیشتر اشیاء پتھر سے بنائی جاتی تھیں۔ آج سے تقریباً چھ ہزار سال پہلے (چار ہزار قبل مسیح) تانبے اور لوہے کا دور شروع ہوا۔ اس دور کے شروع ہونے سے اندازاً ایک ہزار سال بعد ہی جب انسان نے ٹین دریافت کیا تو ٹین اور تانبے کے ملاپ سے ایک نئی دھات بنائی گئی اور کانسی کے زمانے کی ابتدا ہوئی۔ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے تقریباً پندرہ سو سال

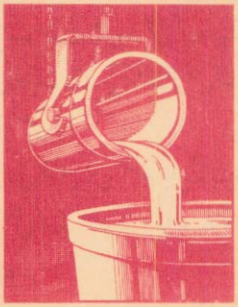

پلاسٹک کا سامان ٹوٹنے پھوٹنے سے لے کر دوبارہ بننے تک کا عمل۔

قبل حضرتِ انسان نے لوہے کو پگھلا کر برتن، اوزار، ہتھیار، زیورات اور نہ جانے کیا کچھ بنانا شروع کر دیا اور ایک بار پھر زمین پر لوہے کے جدید دور کی ابتدا ہو گئی۔

پتھر کے زمانے سے انسان کے سفر کا آغاز ہوا تھا اور آج ہم پلاسٹک کے دور میں رہ رہے ہیں۔ بلاشبہ عہد جدید پلاسٹک کا زمانہ ہی تو ہے۔ ہمارے چاروں طرف پلاسٹک ہی پلاسٹک موجود ہے۔ کیا برتن اور کیا کرسی! کیا ٹیلی ویژن اور کیا ٹیپ ریکارڈر! کیا گاڑی اور کیا لکھنے کا قلم! یہاں تک کہ سودا خریدنے کی تھیلی، بجلی کے آلات، ٹیلی فون، کپڑے، عینک، قالین، آرائش کا سامان بلکہ اب تو انسان کے مصنوعی اعضاء بھی پلاسٹک کے تیار ہونے لگے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر پلاسٹک ایجاد نہ ہوئی ہوتی تو پھر نہ اتنی ایجادات ممکن ہوتیں اور نہ زندگی اتنی آسان ہوتی۔

پلاسٹک کی جدید صنعت کا آغاز پچھلی صدی کی چھٹی دہائی میں ہوا تھا اور آج صرف امریکہ میں پلاسٹک کی مصنوعات کی سالانہ فروخت ۱۰۰ بلین ڈالرز (تقریباً تئیس ۲۳ کھرب روپے) سے زائد ہے۔

دراصل پلاسٹک پٹرول کی ایک ذیلی پیداوار ہے۔ پٹرول (جسے کیمیا کی زبان میں ہائیڈرو کاربن یعنی ہائیڈروجن اور کاربن کا مرکب کہتے ہیں) کی صفائی کے دوران ایک گیس ایتھین پیدا ہوتی ہے جسے پہلے تو "ایتھائی لین" گیس اور پھر "پولی ایتھائی لین" (عرف عام میں "پولی تھین") نامی پلاسٹک میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح پروپین نامی گیس کو "پولی پرو پائی لین" نامی پلاسٹک میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ پلاسٹک کی یہ دو اقسام بوتلیں، پائپ اور پلاسٹک کے تھیلے بنانے میں استعمال ہوتی ہیں۔

پولی تھین کے سالمے (Molecule) میں شامل ایک ہائیڈروجن کے جوہر (Atom) کو اگر کلورین کے جوہر سے تبدیل کر دیا جائے تو پھر ایک نیا پلاسٹک تیار ہوتا ہے جسے پی وی سی کہتے ہیں۔ آگ لگنے کی صلاحیت سے محروم ہونے کی وجہ سے پی وی سی گھریلو استعمال کے لئے ایک بہترین پلاسٹک ہے۔ کیمیادانوں نے پلاسٹک کے میدان میں ایک اور چھلانگ اس وقت لگائی جب انہوں نے کلورین کے ایک جوہر کے بجائے فلورین گیس کے چار جوہر پولی تھین کے سالمے میں داخل کر دیئے۔ اس کے نتیجے میں "ٹیفلون" نامی ایک پلاسٹک حاصل ہوا جس کا خواتین کو ایک فائدہ یہ ہوا کہ انہیں کھانا پکانے کے ایسے برتن مل گئے جس میں تلی جانے والی چیزیں برتن سے چپکتی نہیں۔

عام طور پر پلاسٹک کو دو بنیادی اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ زیادہ تر پلاسٹک "تھرمو پلاسٹک" کہلاتے ہیں جن کو اگر دو سو ڈگری سینٹی گریڈ تک گرم کیا جائے تو یہ پگھل جاتے ہیں اور پھر انکو اپنی مرضی کے نئے سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے۔

دوسری قسم کے پلاسٹک "تھرموسیٹنگ" ہوتے ہیں جو اپنی ایک شکل برقرار رکھتے ہیں اور انکو گرم کر کے دوسرے سانچے میں نہیں ڈھالا جا سکتا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ہائیڈرو کاربن کے مرکبات میں مختلف اجزاء شامل کر کے اُن رنگت اقسام کے پلاسٹک تیار کئے جا سکتے ہیں مگر اب سائنس دان ایک ایسے پلاسٹک کو تیار کرنے میں مگن ہیں جو فولاد سے زیادہ مضبوط، شیشے کی طرح صاف اور پانی کے اثرات سے مکمل محفوظ ہونے کے علاوہ عام کاغذ کی طرح سستا ہو۔

آج کے دور میں کثرت سے تیار کئے جانے والے پلاسٹک پولی تھین پولی اسٹائی رین، ٹیفلون اور نائلون ہیں۔ اس بے پناہ مانگ کی وجہ انکے بے شمار فائدے اور استعمال میں آسانی ہے۔

گو پلاسٹک کی تھیلیاں بہت مفید اور کار آمد چیز ہیں مگر اب ان تھیلیوں کا ایک بہت بڑا نقصان بھی سامنے آیا ہے۔ جابجا بکھری ہوئی پولی تھن کی یہ تھیلیاں صدیاں گزرنے پر بھی گلتی نہیں ہیں۔ یہ تھیلیاں زمین میں دفن ہو کر بھی ویسی ہی رہتی ہیں۔ اگر یہ تھیلیاں پانی کے پائپ یا نکاسی کے نظام میں حائل ہو جائیں تو پانی کا پورا نظام ناکارہ ہو جاتا ہے۔ پولی تھن سے پیدا ہونے والے ان مسائل کے سبب دنیا بھر میں ان تھیلیوں کو استعمال نہ کرنے کی تحریکیں بھی چل رہی ہیں اور اکثر ملکوں میں تو بہت بڑی تعداد ان تھیلیوں کو استعمال کرنے سے گریز کرتی ہے۔ مگر اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ پلاسٹک سرے سے مفید ہی نہیں۔

MASS

گاؤں کی ندی

شبیر بیگ ناز

گاؤں سے ذرا ہٹ کر
کھیتوں سے ذرا کٹ کر
پھولوں سے حسین ندی
تاروں کی جبیں ندی
ڈگ ڈگ پہ مچلتی ہے
گرتی ہے سنبھلتی ہے
زرخیز کنارے ہیں
چاندی کے سے دھارے ہیں
ساون کی پھواروں میں
خوش رنگ بہاروں میں
بوندوں بھری شاموں میں
مہکوں بھری صبحوں میں
جب دھیرے سے گاتی ہے
کیا دل کو لبھاتی ہے
سرسبز کناروں پر
پیڑوں کے حسین منظر
پھیلائے ہوئے بانہیں
جی کھینچ لیں جب چاہیں
گاؤں کا ہر اک بچّہ
گاؤں کا ہر اک بوڑھا

تڑکے یہاں آتا ہے
گاتا ہوا جاتا ہے

روسی کتوں کی ضرورت ہے

انوار اخگر اعوان

امریکہ کے منتظمین جنگلات نے خونخوار ریچھوں سے نمٹنے کے لئے سوویت یونین سے آوارہ کتوں کو منگوانے کی سفارش کی ہے۔ کارلین بیئر (KARELLIAN BEAR) نامی نسل کے ان کتوں کا روس میں اچھی نسل کے کتوں میں شمار تو نہیں ہوتا مگر ان میں ریچھوں سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہے اور انہیں اسی حوالے سے جانا جاتا ہے۔

ییلو اسٹون پارک کے باسی یہ خونخوار ریچھ بڑے ڈھیٹ ثابت ہوئے ہیں۔ کسی اکیلے آدمی کو تو زندہ چھوڑتے ہی نہیں۔ لیکن اصل مسئلہ جو منتظمین کے لئے پریشانی کا باعث بن رہا ہے وہ ان کی ہٹ دھرمی ہے۔ اگر کوئی ریچھ آبادی کے نزدیک اپنا مسکن بنانے کا فیصلہ کر لے تو منتظمین کے پاس اس کا کوئی علاج نہیں۔ اس کا ایک طریقہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ انہیں ڈرا دھمکا کر دور بھگا دیا جائے منتظمین نے انہیں ڈراتے بھگاتے پچاس میل دور تک چھوڑ آنے کا تجربہ بھی کر دیکھا لیکن

وہ پھر اپنے "گھر" پر موجود تھے۔ مسئلے کا دوسرا حل یہ ہے کہ ان کو ختم کر دیا جائے لیکن امریکی قانون ریچھوں کی تیزی سے ناپید ہوتی ہوئی نسل کے ساتھ ایسے سلوک کی اجازت نہیں دیتا۔ تیسرا اور آخری حل یہ ہے کہ انہیں گھومنے پھرنے کی آزادی دی جائے اور اس کے ساتھ ہی ان کو "سبق" سکھا دیا جائے کہ کن کن علاقوں سے ان کو دور رہنا ہے۔ چنانچہ کارلین کتوں کو "طلب" کر لیا گیا ہے تاکہ ان کے ذریعے ان ریچھوں پر واضح کیا جاسکے کہ کون کون سے علاقے ان کے لئے "ممنوعہ" ہیں۔ اگرچہ ۲۰۰ کلو گرام کے ریچھ کے مقابلے میں بیس کلو گرام کا یہ کتا بہت ہلکا ہے۔ لیکن اس میں پھرتی اس قدر ہے کہ ریچھ کو پسپا ہوتے ہی بنتی ہے۔ روسی صدر گورباچوف کی دوسرے ملکوں سے روابط بڑھانے کی پالیسی سے پہلے کوئی ان کتوں کے متعلق نہیں جانتا تھا اور نہ ہی سوویت یونین میں ان کی کوئی حیثیت تھی۔ لیکن اب ان کے متعلق معلومات پھیل چکی ہیں اور بقول امریکی وزیر خارجہ بیکر (BA KER) "یہ کتے ان کا قومی سرمایہ اور قومی راز ہیں۔" انہوں نے ایک وفد تشکیل دینے کی تجویز پیش کی ہے۔ جو سوویت یونین جا کر ان کتوں کی عادات اور ان کو قابو کرنے کے متعلق معلومات حاصل کرے گا۔

کارلین کتا..... اپنے ہاں تو کوئی پوچھتا نہیں امریکہ چل کے دیکھتے ہیں۔

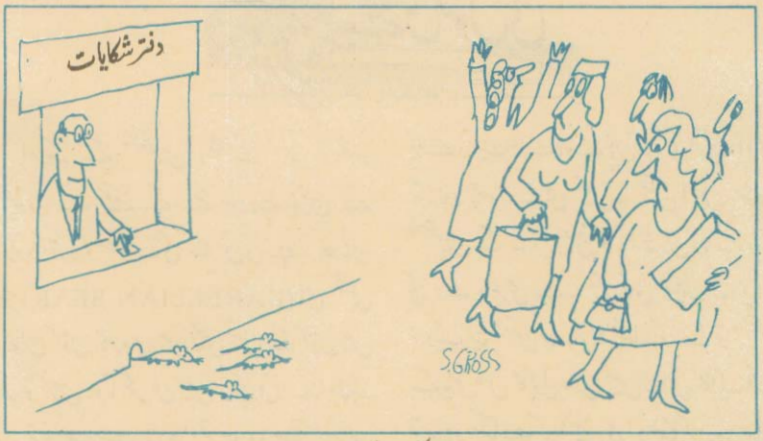

اور کر دو شکایت!

ح ح ح ..... حیرت

کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ صاحب ایک گلاس میں کس طرح سما گئے ؟

یہ دلچسپ تصویر ہمیں سمن آباد
لاہور سے سلطانہ خلیل نے بھجوائی ہے

مگرمچھ کو بھی دیکھیں کِس طرح سیدھا کیا میں نے ۔!

مغربی جرمنی کے پیس سے کو کانے
۲۲۰ پونڈ وزنی مگرمچھ کو
سدھا کر انسانی عقل کو حیرت
میں ڈال دیا۔
اپنے اُستاد کے حکم پر مگرمچھ
سیدھا کھڑا ہوا ہے۔

عالم چنا اور اداکینِ آنکھ مچولی

طاہر مسعود عالم چنا سے گفتگو کرتے ہوئے

مدیر مسئول تجمل حسین چشتی آنکھ مچولی کا سیٹ عالم چنا کو پیش کر رہے ہیں

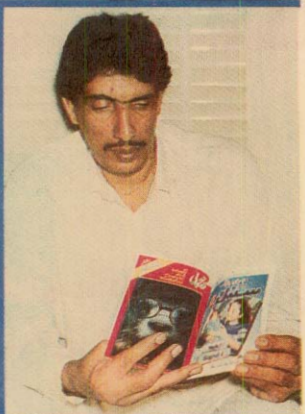

حیرتناک شخصیت حیرتناک نمبر کا مطالعہ کرتے ہوئے

سلیم مغل عالم چنا کو ان کی وہ تصویر دکھا رہے ہیں جو حیرت ناک نمبر میں شائع ہوئی

عالم چنا دفتر آنکھ مچولی میں

طاہر مسعود

میں اسے انسان نہیں، دیو کہوں گا، کہانیوں والا دیو۔ لمبے لمبے ہاتھ، چوڑا چکلا پنجہ، لمبی اور موٹی انگلیاں، خوب بڑا سا چہرہ، بھاری بھرکم جسم، بیٹھے ہونے کے باوجود اس کا سر کھڑکی کے اوپری حصے کو چھو رہا تھا۔ ہم سب اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ یہ عالم چنا تھا۔ دنیا کا سب سے طویل قامت انسان۔ بچپن میں، میں نے گلیور کی کہانی پڑھی تھی۔ گلیور ایک ایسے جزیرے میں پہنچ جاتا ہے جہاں بونے رہتے ہیں۔ گلیور کے سامنے وہ اتنے چھوٹے نظر آتے ہیں کہ گلیور کو انہیں دیکھنے کے لئے تلاش کرنا پڑتا ہے۔ عالم چنا سے مل کر مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے گلیور بونوں کی بستی میں آگیا ہو۔ دفتر کے باہر اسے دیکھنے والوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ اس وقت عالم چنا "آنکھ مچولی" کے دفتر میں تھا اور "حیرتناک نمبر" میں شائع ہونے والی اپنی تصویر کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا

عالم چنا کو طاہر مسعود، دفتر آنکھ مچولی میں خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔

تجمل حسین چشتی، سلیم مغل، منیر احمد راشد اسے اشتیاق بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ صرف اس لئے نہیں کہ وہ دنیا کا سب سے اونچے قد کا انسان ہے بلکہ اس لئے بھی کہ وہ دور دراز کے ملکوں میں پاکستان کی پہچان بن گیا ہے۔ وہ جہاں کہیں بھی جاتا ہے لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ تصویریں اتارنے کی فرمائش کرتے ہیں۔ اس کا تذکرہ "گنیز بک آف ورلڈ" میں کیا جاتا ہے۔ گنیز بک والے جب بھی دنیا کے حیرت انگیز لوگوں کو اکٹھا کرتے ہیں تو عالم چنا کو بلانا نہیں بھولتے۔ اس کی شہرت اتنی پھیل چکی ہے کہ مختلف ممالک کے سربراہ بھی اس سے ملنا اور اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔ جاپان کے شہنشاہ ہیرو ہیٹو نے اسے ملاقات کا شرف بخشا اور حکومت جاپان نے اس کے آگے تحفے تحائف کے ڈھیر لگا دیئے۔ عالم چنا ایک مذہبی انسان اور سچا پاکستانی ہے۔ وہ دنیا بھر میں اسلام کی تبلیغ کرنا چاہتا ہے اور قومی دن کی تقریبات میں جب وہ پاکستان کا پرچم اٹھا کے چلتا ہے تو ہمارا پرچم سب سے بلند نظر آتا ہے۔

عالم چنا کی عمر صرف ۳۳ سال ہے۔ حکومت کی طرف سے اسے پانچ سو روپے ماہانہ وظیفہ ملتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ سیہون شریف میں لعل شہباز قلندر کے مزار پر مامور ہے جس کی اسے علیحدہ سے تنخواہ ملتی ہے۔ وہ پاکستان ٹیلی وژن کا اعزازی افسر تعلقات عامہ ہے۔ دفتر آنکھ مچولی میں اس کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم نے اس سے بہت سی باتیں کیں کیونکہ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ عالم چنا آنکھ مچولی، کے آفس میں آئے اور ہم اپنے ساتھیوں سے اس کی ملاقات نہ کرائیں۔

آنکھ مچولی..... عالم چنا صاحب یہ بتایئے کہ آپ کو کبھی یہ سوچ کر پریشانی نہیں ہوتی کہ آپ عام آدمیوں سے مختلف ہیں۔ یہ سوال ہم آپ سے اس لئے پوچھ رہے ہیں کہ اپنے قد کی وجہ سے آپ جہاں بھی جاتے ہوں گے لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہوں گے۔ اس بات سے آپ کو الجھن نہیں ہوتی۔

عالم چنا..... جی ہاں۔ یہ بات تو ہے۔ میں جہاں بھی جاتا ہوں ایک ہنگامہ ہو جاتا ہے۔ لوگ اپنے اپنے کام چھوڑ کر مجھے دیکھنے لگتے ہیں۔ جس کی وجہ سے میں نہ کسی ہوٹل میں جا سکتا ہوں اور نہ بازار میں خریداری کرنے۔ اس کی وجہ سے مجھے پریشانی تو ہوتی ہے۔

آنکھ مچولی..... تو کیا آپ کی یہ خواہش نہیں ہوتی کہ خدا نے آپ کو بھی ایک عام انسان بنایا ہوتا۔

عالم چنا..... قدرت نے مجھے جس حال میں بھی پیدا کیا ہے میں اس پر خوش ہوں اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔ جن لوگوں کو شہرت مل جاتی ہے وہ عام انسانوں سے چھپنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ شہرت اللہ کی دین ہے اور پھر

چھوٹی کار ـــــــ بڑا آدمی

آپ بندے سے چھپ سکتے ہیں اللہ سے تو نہیں چھپ سکتے۔

آنکھ مچولی..... اچھا یہ بتایئے کہ آپ کو کس عمر میں احساس ہوا کہ آپ کا قد دوسروں کے مقابلے میں بہت زیادہ بڑھتا جارہا ہے؟

عالم چنا..... میں آپ کو شروع سے بتاتا ہوں۔ میرا تعلق چنا خاندان سے ہے۔ ہمارے آبا و اجداد سندھ کے قدیم ترین مسلمانوں میں سے ہیں۔ ہم لوگ سندھ میں محمد بن قاسم کے آنے سے پہلے سے مسلمان ہو چکے تھے۔ کہتے ہیں محمد بن قاسم نے ہمارے خاندان کو دیکھ کر کہا تھا "یہ چنگا خاندان ہے" جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ خوش باش لوگ ہیں۔ یہ چنگا بعد میں بگڑ کر چنا بن گیا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میرے والد کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے مجھے بہت غربت کے دن دیکھنے پڑے۔ میں تعلیم حاصل نہیں کر سکا۔ جس کا مجھے آج تک افسوس ہے کیونکہ میں چاہتا تھا کہ میں پڑھ لکھ کر ایک اچھا انسان بنوں۔ لیکن تعلیم میری قسمت میں نہیں تھی۔ جب میں سولہ سترہ سال کا ہوا تو مجھے احساس ہوا کہ میرا قد دوسروں سے بہت زیادہ ہے اور میں اونچا ہوتا جارہا ہوں۔

آنکھ مچولی..... آپ کو اپنے قد کی وجہ سے روز مرہ کاموں میں سب سے زیادہ تکلیف کس کام میں ہوتی ہے۔ یعنی چلنے پھرنے میں، اٹھنے بیٹھنے میں یا سونے جاگنے میں۔

عالم چنا..... سارے ہی کاموں میں تکلیف ہوتی ہے۔ سونے کے لئے مجھے بڑا پلنگ چاہئے۔ بیٹھنے کے لئے بڑی کرسی چاہئے۔ سفر کرنے کے لئے اونچی کار چاہئے۔ پچھلی حکومت نے مجھے سوزوکی آلٹو تحفے میں دی۔ اس کار میں بیٹھنے کے لئے مجھے اگلی سیٹ آگے کھسکانی پڑتی ہے۔ اندر مجھے سر جھکا کے بیٹھنا پڑتا ہے کیونکہ چھت میرے سر سے ٹکراتی ہے۔ لباس پہننے کے لئے بہت زیادہ کپڑے کی ضرورت ہوتی ہے۔

آنکھ مچولی..... مثلاً ایک شلوار قمیض کے لئے آپ کو کتنے کپڑے کی ضرورت ہوتی ہے؟

عالم چنا..... ۱۴ میٹر کپڑوں میں میری شلوار قمیض بنتی ہے۔ درزی عام شلوار قمیض کے لئے اسی نوے روپے لیتا ہے تو میرے کپڑے سینے کے لئے وہ ۲۲۰ روپے وصول کرتا ہے۔ مجھے اسپیشل جوتے بنوانے پڑتے ہیں۔

آنکھ مچولی..... چنا صاحب! اب تو آپ کی شادی ہوگئی ہے لیکن چند سال پہلے جب آپ کی شادی ہوئی تھی تو سنا ہے چین میں دنیا کی سب سے لمبی لڑکی تھی جس سے آپ کی شادی کی بات چیت چل رہی تھی؟

عالم چنا..... اس لڑکی سے شادی کی باقاعدہ بات چیت تو نہیں ہوئی تھی۔ لیکن میں نے سنا تھا کہ اس لڑکی کے بارے میں اخباروں میں بہت کچھ چھپا ہے۔ میری کبھی اس سے ملاقات بھی نہیں ہوئی۔ پھر ایک دن معلوم ہوا کہ اس کا انتقال ہوگیا۔

آنکھ مچولی..... آپ کی شادی کیسے ہوئی۔ رشتہ کیسے طے پایا؟

عالم چنا..... شروع میں تو میں نے کوشش کی کوئی اونچے قد والی لڑکی مل جائے۔ بہت دنوں تک ڈھونڈا بھی گیا لیکن ایسی کوئی لڑکی نہیں مل سکی۔ پھر ایک عام لڑکی سے میری شادی ہوئی۔ میں اس زمانے میں اپنی بیوی کے ساتھ امریکہ میں تھا جب میرا بچہ پیدا ہوا۔ اس کا نام عابد علی چنا ہے اور اس کی عمر دس ماہ ہے۔ امریکہ کا قانون ہے کہ جو بچہ امریکہ میں پیدا ہو اسے امریکہ کی شہریت دے دیتے ہیں تو میرے بچے کے پاس بھی امریکی شہریت ہے۔

آنکھ مچولی..... آپ اب تک بے شمار ملکوں میں جاچکے ہیں آپ کو سب سے زیادہ عزت کس ملک میں ملی؟

عالم چنا..... میں جہاں بھی گیا لوگ عزت سے پیش آئے۔ لیکن سب سے زیادہ جاپان اور سعودی عرب میں میرا استقبال کیا گیا۔ سعودی عرب کی حکومت نے تو فرمائش کی کہ میں وہیں رہ جاؤں۔ مجھے سب سے زیادہ اچھے جاپانی لگے۔ وہ واقعی مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ پچھلے دنوں گنیز بک والوں نے دنیا کے حیرت انگیز لوگوں کو وہاں جمع کیا تو مجھے بھی بلایا۔ عجیب عجیب طرح کے لوگ آئے تھے۔ کوئی دنیا کا سب سے موٹا آدمی تھا تو کوئی دنیا کا سب سے چھوٹا آدمی تھا کوئی دنیا کا سب سے بوڑھا آدمی تھا۔ وغیرہ۔ جاپان ٹیلی وژن نے مجھ پر ایک پروگرام پیش کیا۔ یہ پروگرام براہ راست پیش ہوا۔ اس پروگرام میں مجھ سے انٹرویو لینے والے نے بہت سے سوال کرنے کے بعد پوچھا کہ آپ جاپان کے عوام کے لئے کیا تحفہ لائے ہیں۔ تو میں نے ایک چھوٹا سا بکس دے کر کہا "جاپان کے عوام کے لئے تحفہ اس بکس میں ہے۔" جب بکس کھولا گیا تو اس میں دنیا کا سب سے چھوٹا آدمی بند تھا۔ وہ اچھل کر بکس سے باہر آگیا۔ دیکھنے والوں کو بہت مزہ آیا۔ میرا یہ تحفہ انہیں اس لئے بھی پسند آیا کہ جاپانی خود چھوٹے قد کے ہوتے ہیں۔

یہ مذاق پروگرام پیش کرنے والوں کی ہدایت پر میں نے کیا تھا۔ اس چھوٹے آدمی کی تصویر آپ "حیرتناک نمبر" میں چھاپ چکے ہیں۔

آنکھ مچولی..... جاپان کی سب سے اچھی بات کو کون سی لگی؟

عالم چنا..... ان کا معاشرہ اچھا ہے۔ بہت محنتی اور ایماندار لوگ ہیں۔ میں جب بھی جاپان جاتا ہوں۔ انوکی سے ضرور ملتا ہوں۔ انوکی بہت زبردست پہلوان ہے۔ وہ مسلمان ہو گیا ہے اور اسلام کی تبلیغ کرنا چاہتا ہے۔ جاپان کی حکومت اس کے مسلمان ہونے پر اس سے ناراض بھی ہے۔ انوکی کو پاکستان سے بہت محبت ہے اور اس کی خواہش ہے کہ وہ پاکستانی نوجوانوں کو تربیت دے۔ لیکن یہاں کسی کو دلچسپی ہی نہیں ہے۔

آنکھ مچولی..... آپ کو حکومت کی طرف سے جو وظیفہ ملتا ہے۔ یا محکمہ اوقاف سے جو تنخواہ ملتی ہے اس سے آپ کی گزر بسر ہو جاتی ہے؟

عالم چنا..... کہاں ہوتی ہے سائیں۔ بس اللہ نے عزت رکھی ہوئی ہے۔ صدر ضیاء الحق نے پانچ سو روپے کا وظیفہ لگا دیا تھا اور دو کمروں کا مکان بنوا دیا تھا۔ بے نظیر بھٹو کی حکومت نے ایک کار تحفے میں دی اور کسی نے تو پوچھا نہیں۔

آنکھ مچولی..... آپ بیمار تھے تو صدر مملکت آپ کی عیادت کرنے آئے تھے آپ نے ان سے اپنا مسئلہ بیان نہیں کیا؟

عالم چنا..... وہ میرا حال پوچھنے آئے تھے ان کی

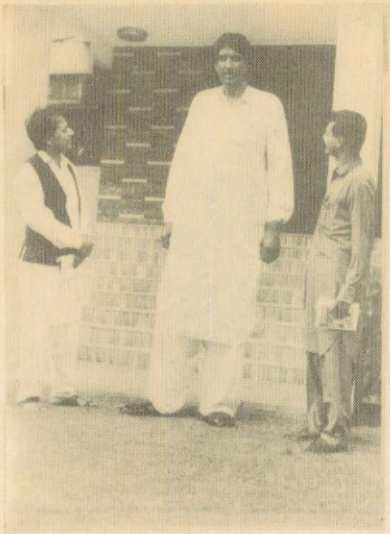

حیرت زدہ مدیران اعزازی۔

بڑی مہربانی تھی۔ اس وقت مجھے اچھا نہیں لگا کہ میں ان سے اپنی پریشانی بیان کروں۔

آنکھ مچولی..... آپ کو دنیا کے کس ملک کے بچے اچھے لگے؟

عالم چنا..... بچے تو ہر ملک کے اچھے ہوتے ہیں۔ بچے کی آواز تو خدا کی آواز ہوتی ہے اور مجھے تو بچے اس لئے بھی اچھے لگتے ہیں کہ بچے ہی اپنے ماں باپ کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ مجھے دیکھنے کے لئے چلیں۔

"آنکھ مچولی" سے گفتگو کے دوران بھی عالم چنا کی طبیعت اچھی نہیں تھی۔ وہ ہسپتال سے چھٹی لے کر دفتر آیا تھا۔ بات چیت ختم ہوئی تو ہم تصویریں بنوانے کے لئے باہر آئے۔ باہر اسے دیکھنے والوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا۔

اراکین آنکھ مچولی عالم چنا کے ساتھ۔

اتنے میں آنکھ مچولی کے سرکولیشن منیجر ریاض بھی سلیم مغل کا کیمرہ لئے آگئے۔ ریاض دفتر میں سب سے گرانڈیل آدمی ہیں۔ موٹے تازے نہایت صحت مند، گرمی، سردی برسات کسی موسم کا ان کی صحت پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ لیکن میں نے عالم چنا کے پاس ریاض کو کھڑے ہوئے دیکھا تو کچھ ایسا لگا جیسے کسی اونچے پہاڑ کے سائے میں کوئی بچہ کھڑا ہو۔

اس دنیا میں اربوں انسان رہتے ہیں اور اپنی کسی ایک خصوصیت میں اربوں انسانوں سے ممتاز ہونا کوئی معمولی بات نہیں۔ عالم چنا کو یہ امتیاز اور فخر حاصل ہے کہ وہ دنیا کا سب سے بلند قامت انسان ہے لیکن اپنے اخلاق اور انکسار سے ایک لمحے کے لئے اس نے محسوس نہیں ہونے دیا کہ اس میں ایسا کوئی فخر یا غرور پایا جاتا ہے اور آدمی کی اصل بڑائی یہی ہے کہ وہ اونچا ہو کر بھی خود کو اونچا نہ سمجھے!

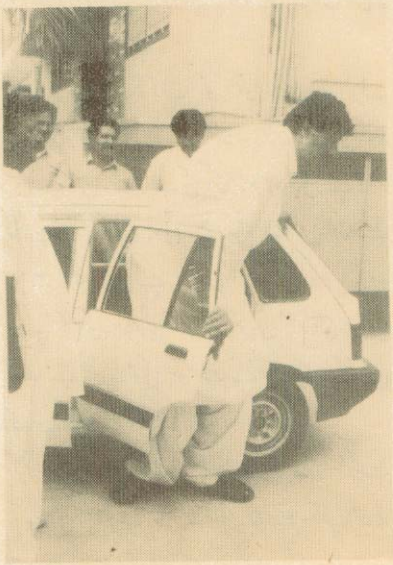

میں قسطوں میں اُٹھتا بیٹھتا ہوں۔

آپ کو مبارک ہو

آپ کی چھوٹی سی کوشش ملک گیر تحریک بن گئی

آنکھ مچولی کے قارئین ساتھیوں نے اپنے بڑوں میں ترکِ سگریٹ نوشی کی جو مہم آج سے چار سال قبل شروع کی تھی، اس کی بازگشت آج ملک بھر میں سنائی دے رہی ہے۔

آنکھ مچولی کی ننھی سی کوشش آج مکمل تحریک کی صورت اختیار کر چکی ہے

یہ تحریک جاری ہے.... جاری رہے گی اس وقت تک جب تک وطنِ عزیز کی عطر بیز فضا سے سگریٹ کا زہر آلود دھواں بالکل چھٹ نہیں جاتا۔

آیئے اپنے بزرگوں کی صحت و تندرستی اور درازیٔ عمر کی دُعا مانگیں اور ان کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر پھینک دیں کہ یہ ان کی اور ہماری دونوں کی دشمن ہے

مقابلہ مصوّری

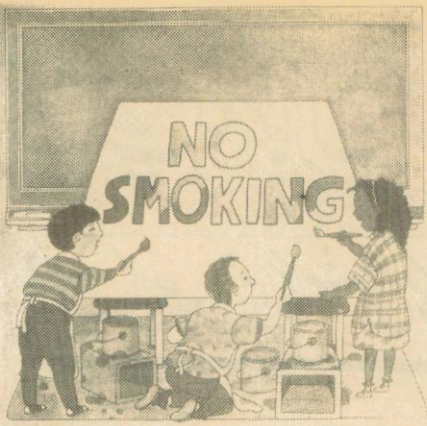

ہر سُو رنگ بکھرائیں
ہر اِک کو سمجھائیں
سگریٹ نہ سُلگائیں

کیا آپ مصوّری کے ایسے مقابلے میں شریک ہونا پسند کریں گے
جو بامقصد بھی ہو اور دلچسپ بھی !!

مقابلے کا موضوع ہے

سگریٹ ہماری دشمن

مقابلے میں شرکت کی شرائط

- تصویر کا سائز $4\frac{1}{2}'' \times 7\frac{1}{2}''$
- رنگ : پوسٹر کلر یا واٹر کلر (پنسل کلر میں یا بلیک اینڈ وائٹ تصویر قابل قبول نہ ہوگی)
- تصویر کو موڑ کر نہ بھیجیں
- تصویر کی پشت پر اپنا نام اور پتہ ضرور لکھیں۔
- دو سے زیادہ تصاویر ایک نام کے ساتھ نہیں آسکتیں۔
- آخری تاریخ —— ۲۵ اگست ۱۹۹۱ء

پتہ
مقابلہ مصوّری
ماہنامہ آنکھ مچولی
۱۱۲۔ ڈی، سائیٹ، کراچی

انعامات: چار خصوصی، چار عمومی، کُل 8

مسٹر حیرت اور مسٹر ناک کی حیرتناک کہانی

شیخ عبد الحمید عابد

"مسٹر حیرت اور مسٹر ناک دونوں پڑوسی تھے۔ اور اکثر اکٹھے رہتے تھے۔ ان کی دوستی بہت پرانی تھی۔ گاؤں والے ان کی دوستی کی مثال دیتے تھے۔ لیکن ایک بات بہت بری تھی کہ دونوں دوست بہت ضدی تھے اور اکثر بے پر کی اڑاتے رہتے تھے۔ اور جس بات پر اڑ جاتے تھے۔ اس سے پیچھے نہ ہٹتے۔ ان کی مثال اس خچر کی طرح تھی جو اڑ جائے تو پھر مشکل سے ہی آگے بڑھتا ہے۔

ایک دفعہ مسٹر حیرت کہنے لگے کہ امریکہ میں گائیں پَر رکھتی ہیں اور پرندوں کی طرح اڑتی ہیں۔ یہ سن کر مسٹر ناک نے جواب دیا۔

"اور ترکی میں ہتھوڑے اور کیل کھیتوں میں اگتے ہیں۔"

یہ جواب سن کر مسٹر حیرت کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

ایک دن مسٹر حیرت اور مسٹر ناک کچھ لکڑیاں لینے جنگل میں جا رہے تھے۔ مسٹر ناک نے کہا

"میرے دوست کیا تمہارے پاس نیا کلہاڑا ہے؟"

"ہاں! نیا ہے" مسٹر حیرت نے کہا۔ "اور ایسا کلہاڑا تم نے پہلے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ یہ صرف لکڑیاں نہیں کاٹتا بلکہ پتھروں کو بھی کاٹ دیتا ہے۔"

"مجھے یقین نہیں آرہا" مسٹر ناک نے کہا۔ "لیکن پھر بھی میرے کلہاڑے کا جواب نہیں۔ یہ اگرچہ پرانا ہے۔ لیکن تم نے سنا ہوگا اولڈ از گولڈ۔ کوئی میرے کلہاڑے کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ایک مرتبہ صرف سان پر رگڑنے کی ضرورت ہے پھر تم چاہو تو اس کلہاڑے سے اپنی شیو بنالو۔" یہ سن کر مسٹر حیرت کہنے لگے" مجھے اپنے کلہاڑے کو چمکانے کے لئے سان کی ضرورت نہیں ایسا کرنے کے لئے صرف میری ایک پھونک ہی کافی ہے۔ اور پھر میری صرف ایک ضرب بڑے سے بڑے درخت کو نیچے گرانے کے لئے کافی ہے۔"

یہ سن کر مسٹر ناک بھلا کب پیچھے رہنے والے تھے۔ اپنے کلہاڑے کے دستے کو مضبوطی سے پکڑ کر بولے" مجھے صرف کلہاڑے کو ہوا میں لہرانے کی ضرورت ہے۔ بڑے بڑے درخت خود بخود زمین سے اکھڑ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔" مسٹر حیرت نے کہا۔ "اچھا ایسی ہی بات ہے تو پھر ذرا اس سیب کے درخت کو تو بھگا کر دکھاؤ۔"

مسٹر ناک نے جواب دیا۔ "یہ کون سی مشکل بات ہے۔ لو ابھی دیکھ لو۔" یہ کہہ کر جونہی انھوں نے کلہاڑا ہوا میں لہرایا۔ ان کی کنپٹی پر ایک زور دار مکّہ پڑا اور مسٹر ناک اچھل کر دور جا پڑے۔

"مسٹر حیرت! یہ کیا بدتمیزی ہے۔" وہ درد سے چلائے۔

"یہ میری بدتمیزی نہیں ہے مسٹر ناک میں ایسی حرکت کبھی نہیں کرتا۔" مسٹر حیرت بولے۔

اب جو مسٹر ناک نے دیکھا کہ باغ کا مالک مزید پٹائی کرنے کے لئے آگے بڑھ رہا تھا۔ پھر تو آپ سمجھ ہی سکتے ہیں کہ دونوں گپاسٹک دوست وہاں سے کس طرح رفو چکر ہوئے ہوں گے۔

خزاں کا موسم آیا تو مسٹر حیرت اور مسٹر ناک نے اپنی بندوقیں صاف کیں اور شکار کو نکل کھڑے ہوئے۔ راستے میں مسٹر حیرت کہنے لگے۔ "آؤ ہم کسی ریچھ کو تلاش کریں ہم اسے آسانی سے مار لیں گے۔"

مسٹر ناک نے یہ سن کر حیرت کا تمسخر اڑایا اور کہا "ایک کیا میں تو ایک درجن ریچھ کو ایک ساتھ مار سکتا ہوں۔ مجھے یاد ہے جب میں چھوٹا سا تھا تو میں نے ایک گھنٹے میں دو درجن خرگوش شکار کئے تھے۔ یہ سن کر مسٹر حیرت بھلا کب پیچھے رہنے والے تھے، بولے "اور جب میں بچہ تھا تو ایک وقت میں اتنے خرگوش شکار کر لیتا تھا کہ مجھے انہیں لے جانے کے لئے چھکڑے منگوانے پڑتے تھے۔ اور اس لئے میں

صرف موٹے موٹے خرگوش لے جاتا اور باقی کوؤں کے لئے چھوڑ دیا کرتا تھا۔"

"اس میں کون سی حیرانی کی بات ہے۔" مسٹر ناک نے کہا۔ "میں نے ایک دفعہ گندم کے دانے جتنی گولی سے چودہ مرغابیاں مار ڈالی تھیں۔" یہ سن کر مسٹر حیرت کہاں چپ رہتے تیزی سے بولے۔ "تمہیں معلوم ہے ایک دفعہ میرے ساتھ کیا ہوا۔"

"کوئی معمولی سا واقعہ ہوا ہو گا؟" مسٹر ناک نے طنزیہ انداز میں لقمہ دیا۔ "اصل واقعہ تو میرے ساتھ ہوا تھا جب شکار کے دوران میری سب گولیاں ختم ہو گئیں تو میں نے چھوٹی سی کیل کو بطور گولی استعمال کر کے دو ہاتھیوں کو ایک ہی حملے میں ہلاک کر دیا تھا۔ بلکہ کیل ہاتھیوں کو چیرتی ہوئی جا کر لومڑی کی دم پر لگی اور دم اڑ کر درخت کی شاخ سے اٹک گئی۔" مسٹر حیرت نے اس واقعے کا کوئی اثر نہ لیا اور اپنی دھن میں بولتے گئے۔

"پچھلے سال میں نے اپنی بندوق میں گولی کی جگہ بارہ مصالحے ڈال دیئے اور مرغابیوں کو نشانہ بنایا اور ایک ہی ہلے میں سات مرغابیوں کو گرا دیا۔ جب میں انھیں اٹھانے گیا تو وہ روسٹ ہو چکی تھیں جنہیں میں مزے لے لے کر کھاتا رہا۔"

"بہتر یہ ہے کہ تم شکار وغیرہ چھوڑ کر کسی گھر کا باورچی خانہ سنبھال لو!" مسٹر ناک نے چوٹ کی۔

اسی طرح لڑتے جھگڑتے ہوئے دونوں واپس اپنی بستی پہنچ گئے۔ حالانکہ دونوں شکار کے لئے نکلے تھے لیکن انھیں گپیں ہانکنے سے فرصت ہی کب تھی جو وہ شکار کرتے۔ بستی میں گھروں کے باہر گیلے کپڑے رسیوں پر سوکھ رہے تھے۔ مسٹر ناک نے اپنی بندوق اٹھائی اور ایک سوکھی ہوئی ٹوپی کو نشانہ بنایا تاکہ مسٹر حیرت پر اپنی نشانہ بازی کا رعب جمانے کا موقع مل سکے۔

مسٹر حیرت نے بھی اپنی بندوق اٹھالی اب جو دونوں کی بندوقیں چلیں تو سوکھے ہوئے کپڑوں کو گولیاں چھید کر گئیں۔ یہ منظر دیکھ کر دونوں قہقہے لگانے لگے۔

ادھر گولیوں کی آواز سنتے ہی بستی کے لوگ باہر نکل آئے اور یہ دیکھ کر کہ مسٹر حیرت اور مسٹر ناک نے ان کے کپڑے گولیوں سے چھلنی کر دیئے ہیں ان کے پیچھے بھاگے اور پکڑ کر دونوں کی خوب مرمت کی اس کے بعد کئی روز تک تو دونوں کی ہمت نہ پڑی لیکن بے پر کی اڑانے سے وہ کہاں باز آنے والے تھے۔

انہی دنوں خدا کا کرنا یہ ہوا کہ مسٹر حیرت کی جھونپڑی کو لالٹین سے آگ لگ گئی۔ اور پھیلتے پھیلتے مسٹر ناک کے اسٹور روم تک پہنچ گئی اور ان کے پڑوسی مدد کو دوڑے کہ آگ بجھائیں۔ لیکن دونوں دوست بجائے آگ پر قابو پانے کے لگے اونچی ہانکنے۔ مسٹر ناک فرمانے لگے۔ "میرا خیال ہے کہ آگ جلے ہوئے دودھ

سے بہتر طور پر بجھائی جاسکتی ہے۔" حیرت نے کہا "جمے ہوئے دودھ کے مقابلے میں شہد زیادہ بہتر ہے۔ اس وقت جو آگ لگی ہوئی ہے اس پر ایک ڈرم شہد پھینک دیا جائے تو آگ فوراً بجھ جائے گی۔ ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ان کے گھر کی چھت سامان سمیت جل کر زمین پر آرہی۔

مسٹر حیرت اور مسٹر ناک پر چھت کا سایہ بھی نہ رہا۔ یہ دیکھ کر دونوں کو احساس ہوا کہ کتنا بھاری نقصان ہو گیا۔ دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ گئے اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ اس دن کے بعد مسٹر حیرت اور مسٹر ناک بے گھر ہیں لیکن وہ جدا نہیں ہوئے۔ وہ دن اور آج کا دن حیرت اور ناک اس طرح اکٹھے ہیں کہ کتابوں رسالوں اخباروں غرض یہ کہ ہر جگہ دونوں ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں۔ شاید اسی لئے آنکھ مچولی نے ان دونوں دوستوں کی یاد میں اپنے خصوصی شمارے کا نام رکھا ہے۔

حیرت ناک نمبر

کیا ہی اچھا ہوتا اگر شمارے کا عنوان ہوتا "مسٹر حیرت اور مسٹر ناک نمبر!"

مشکل سوال

ایک خاتون نے ماہر نفسیات سے دریافت کیا "ڈاکٹر صاحب کسی شخص کی ذہنی سطح معلوم کرنے کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟"

"یہ تو بہت معمولی بات ہے آپ کوئی بھی آسان سوال اس سے پوچھ لیں اگر وہ فوراً درست جواب دے دے تو اس کا مطلب ہے کہ اس میں ذہانت کی کمی نہیں ہے" ڈاکٹر نے کہا۔

"مثلاً" خاتون نے پوچھا۔ "مثلاً یہ کہ محمود غزنوی نے سومنات پر سترہ حملے کئے تھے بتایئے اس نے سترہواں حملہ پہلے کیا تھا یا سولہواں؟"

خاتون چند لمحے سوچتی رہی پھر بولیں۔

"ڈاکٹر صاحب یہ تو ذرا مشکل سوال ہے کوئی آسان سا سوال بتایئے۔"

انتخاب:۔ شوکت صدرالدین، کراچی۔

انعامی لطیفہ

فیروز خان نون کی پہلی بیوی بیگم نون کے نام سے موسوم ہیں۔ جب فیروز خان نون نے دوسری شادی کرلی تو ان کی ایک شناسا نے مولانا سالک سے بطور مشورہ پوچھا۔ "اب دوسری بیوی کو کیا کہا جائے گا؟" مولانا نے بے ساختہ جواب دیا After Noon.

مرسلہ۔ نادیہ قادر خان گوجرانوالہ۔

ایک اسکول میں داخلے کے لئے بچوں کا انٹرویو ہو رہا تھا جب ایک چھوٹے سے بچے کی باری آئی تو میڈم نے اسے اپنے سامنے والی کرسی پر بٹھایا، بچے کی ماں فوراً اٹھ کر میڈم کے پیچھے کھڑی ہوگئی اور اشارے سے بچے کو جوابات بتانے لگی میڈم نے بچے سے پوچھا دو اور دو کتنے ہوتے ہیں، ماں نے فوراً انگلیوں کی مدد سے بچے کو چار کا اشارہ کیا بچے نے جواب دیا چار۔ پھر میڈم نے پوچھا تین میں سے دو نکالیں تو کتنے بچیں گے۔ ماں نے پھر ایک انگلی کھڑی کرکے دکھائی بچے نے جواب دیا۔ "ایک" میڈم نے بچے کو شاباشی دی اور پھر پوچھا اچھا دو میں سے دو نکالیں تو کتنے بچیں گے؟ ماں نے فوراً انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے ایک گول دائرہ بنا کر صفر کا اشارہ کیا بچے نے اشارہ دیکھا اور فوراً بولا "سوراخ"۔

پرنس امیر محمد خان کراچی

جن دنوں ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت تھی۔ انہی دنوں میں ایک انگریز افسر کا ملازمت کے سلسلے میں ہندوستان میں آنا ہوا۔ وہ ایک دن اپنے بیٹے کے ساتھ اس پارک میں گیا، جہاں ہندوستان کے سابق وائسرائے لارڈ ڈیول کا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ جس میں وہ گھوڑے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس انگریز افسر کے بیٹے کو وہ مجسمہ بہت پسند آیا۔ وہ ہر روز اپنے والد کے ساتھ اس پارک میں جا کر مجسمہ دیکھتا۔ کچھ ہی دنوں بعد انگریز کو برطانیہ واپسی کے احکامات ملے۔ اس نے اپنے بیٹے سے کہا کہ اب

ڈنڈا ڈولی

اسے واپس برطانیہ جانا ہے۔ اس کے بیٹے کو یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔ اس نے اپنے والد سے کہا کہ وہ اسے آخری بار لارڈ دیول کا مجسمہ دکھالائیں۔ اس کے والد خوشی خوشی اسے پارک میں لے گئے۔ تو وہ مجسمے کے پاس جا کر بولا "میرے دوست دیول ! شاید یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ مجھے واپس اپنے ملک جانا ہے۔ گھر پہنچ کر وہ اپنے والد سے بولا کہ ابو ! مجھے یہ تو بتائیں کہ دیول کے اوپر جو شخص بیٹھا تھا وہ کون تھا؟ روحی عزیز، کراچی

پروفیسر (طالب علم سے) غلطی اور حماقت میں کیا فرق ہے؟

طالب علم۔ جناب! اگر آپ مسجد میں پرانا جوتا بھول کر کسی کا نیا جوتا پہن لیں تو اسے غلطی کہتے ہیں اور اگر اپنا پرانا جوتا پہن لیں تو اسے حماقت کہتے ہیں۔ نویداختر، کراچی

ایک انگریز نے حضرت حسن نظامی سے پوچھا۔ "سارے انگریزوں کا رنگ ایک سا ہوتا ہے لیکن پتہ نہیں کیوں سارے ہندوستانیوں کا رنگ ایک سا نہیں ہوتا؟" خواجہ حسن نظامی نے جواب دیا۔ "گھوڑوں کے رنگ مختلف ہوتے ہیں لیکن سارے گدھوں کا رنگ ایک سا ہوتا ہے۔" ریحانہ شکیل، کراچی

فارس کے مشہور شاعر مولانا جامی کو ایک فضول گو شاعر نے بڑے فخر سے بتایا کہ وہ حج پر گیا تھا تو اس نے حصول برکت کے لئے اپنے اشعار کو حجر

ابّو آپ کہہ رہے تھے نا کہ اسکول کی رپورٹ ذہانت کا معیار نہیں ہوتی۔

اسود سے مس کیا تھا۔ مولانا جامی بولے اگر ایک غوطہ آب زم زم میں بھی دے لیتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ ندیم شاہد، مخدوم پور، بوتاں

ایک وکیل نے عدالت میں جج سے کہا "جناب! میں آپ سے درخواست کروں گا کہ میرے مؤکل کے مقدمے کی دوبارہ سماعت شروع کی جائے۔ میرے علم میں ایک نیا ثبوت آیا ہے۔ جس سے اس مقدمے میں جان پڑ سکتی ہے۔ جج نے پوچھا "کیسا ثبوت؟"

وکیل نے جواب دیا "اس بات کا ثبوت کہ میرے مؤکل کے پاس ابھی بیس ہزار روپے اور ہیں۔" فاروق احمد پیرزادہ۔ پاک پتن

استاد...... اگر ایک اور ایک دو ہوتے ہیں۔ دو اور دو چار ہوتے ہیں، تین اور تین چھ تو سات اور

میں پوچھتی ہوں، یہ تمہاری تیسری ٹانگ کہاں سے آئی؟

سات کتنے ہونگے۔

شاگرد ..... جناب آسمان والے تو آپ نے حل کر لئے اور مشکل والا ہمارے لئے چھوڑ دیا۔

تنویر اقبال۔ میرپور آزاد کشمیر

ایک آدمی نے ہوٹل میں چلاّتے ہوئے سب کو دعوت دی، "جب پیوں تو سب لوگ میرا ساتھ دیں" جب اس نے اپنا شربت ختم کر لیا تو دوبارہ چلایا، "جب میں دوسرا پیوں تو ہر آدمی دوسرا گلاس پیئے۔" ہر شخص نے شکریئے کے ساتھ دوسرا گلاس بھی لے لیا۔

جب اس شخص نے دوسرا گلاس بھی ختم کر لیا تو جیب سے دو روپے نکالے اور کاؤنٹر کی طرف جاتے ہوئے چلا کر کہا، "جب میں بل ادا کروں تو سب لوگ بھی بل ادا کریں۔"

سیدہ کاشفہ خاتون کراچی

ایک دفعہ ایک سبزی فروش کے گھر لڑکا پیدا ہوا۔ اس کا ایک ہمسایہ اسے مبارک باد دینے آیا تو سبزی فروش سے پوچھا کہ لڑکا کیسا ہے۔

سبزی فروش نے کہا۔ بالکل تازہ ہے۔

لیاقت علی لاہور

دادا جان نے پوتے کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ بیٹا کام کرو بیکار پھرنا اچھا نہیں جب میں تمہاری عمر کا تھا تو میں نے بیس روپے ماہوار پر نوکری کر لی تھی اور پھر پانچ سال بعد اسی دُکان کا مالک بن گیا تھا۔

پوتے نے بڑی معصومیت سے جواب دیا دادا جان آج کل ایسی دھاندلی نہیں چلتی۔ ہر ایک دکان پر اب باقاعدہ حساب کتاب لکھا جاتا ہے۔

ارم فاطمہ کراچی

بہن (بھائی سے) تمہارے دماغ میں گوبر بھرا ہے (بھائی) جب ہی تو تم میرا دماغ چاٹتی رہتی ہو۔

کوثر فاطمہ کراچی

ایک صاحب کشمیر گئے تو وہاں فر کے کوٹ کم قیمت میں بکتے دیکھ کر ان کا جی للچایا انہیں اپنی والدہ سے بہت محبت تھی انہوں نے سوچا کہ اپنی والدہ کے لئے ایک کوٹ خرید لیں اپنے ارادے پر عمل کرتے ہوئے انہوں نے ایک عمدہ سا کوٹ خریدا اور پارسل کرنے سے پہلے کاغذ کی وہ چٹ علیحدہ

کر دی جس پر کوٹ کی قیمت تین ہزار روپے لکھی ہوئی تھی اور اس جگہ کوٹ پر دوسری چٹ لگا دی۔ دوسری چٹ پر انھوں نے کوٹ کی قیمت پانچ سو روپے لکھی۔ چند دن بعد انہیں اپنی والدہ کا تار موصول ہوا جس کا مضمون تھا "پانچ سو روپے کا کوٹ ہزار روپے میں بیچ دیا فوراً اچھے کوٹ اور بھیج دو!" تسنیم عالم منظر، حیدر آباد

خواتین بینک پر کامیاب ڈاکہ ڈالنے والے گروہ کو بالآخر پولیس نے کچھ دور جاکر گرفتار کرلیا۔ ڈاکوؤں کے پاس سے نقدی اور زیورات کے علاوہ تین عدد چھپکلیاں اور ۲ عدد کاکروچ بر آمد ہوئے۔ سیّد کاشف طاہر، سعودی عرب

ایک شخص اپنا گدھا فروخت کرنا چاہتا تھا۔ اسے پتہ چلا کہ اس کا ایک دوست بھی گدھا خریدنا چاہتا ہے۔ اس نے اپنے دوست کو لکھا۔ "بھائی اگر تمہیں ایک اچھے گدھے کی ضرورت ہو تو مجھے یاد کر لینا۔" سیّدہ شفق غزالہ۔ کراچی

استاد۔ بچو! تم اٹھارہویں صدی کے سائنس دانوں کے بارے میں کیا جانتے ہو؟

شاگرد۔ جناب! سارے ہی مر گئے ہیں۔

ہمارضوی کوئٹہ

بھائی جان! کیا تمہارے ماسٹر صاحب یہ سمجھ گئے کہ ان سوالوں کو حل کرنے میں کسی نے تمہاری مدد کی ہے۔ ارشد۔ جی ہاں وہ کہہ رہے تھے کہ ایک آدمی اتنی غلطیاں نہیں کر سکتا۔

مسعود الرحمٰن، کراچی

ہر وقت پڑھنے کی بات — کوئی اور بات کرو یار!

دو افیمی ایک کنویں کے قریب ہی چارپائی پر سو رہے تھے رات کو ایک افیمی کنویں میں گر جاتا ہے وہ دوسرے کو آواز دیتا ہے "یار مجھے باہر نکالو" دوسرا جواب دیتا ہے "یار باہر آکر کیا کرنا ہے افیم تمہارے پاس ہے پانی کے ساتھ کھالو" پہلا کہتا ہے "نہیں تم مجھے باہر نکالو" اس پر باہر والے نے اپنی پگڑی کنویں میں لٹکا کر پوچھا پکڑ لیا تو اندر والے نے کہا ہاں پکڑ لیا "اچھی طرح پکڑ لیا" ہاں اچھی طرح پکڑ لیا" تو میں نے چھوڑ دیا" اوپر والے افیمی نے کہا۔ عبدالحفیظ شاہد، ضلع خانیوال

ایک کنجوس آدمی مٹھی میں ایک روپیہ لئے جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب اس نے مٹھی کو کھولا تو اس کی ہتھیلی پر پسینہ آیا ہوا تھا۔ کنجوس نے کہا "نہ رو میرے پیارے روپے میں تمہیں ہرگز خرچ نہیں کرونگا"

بشریٰ عزیز..... کراچی

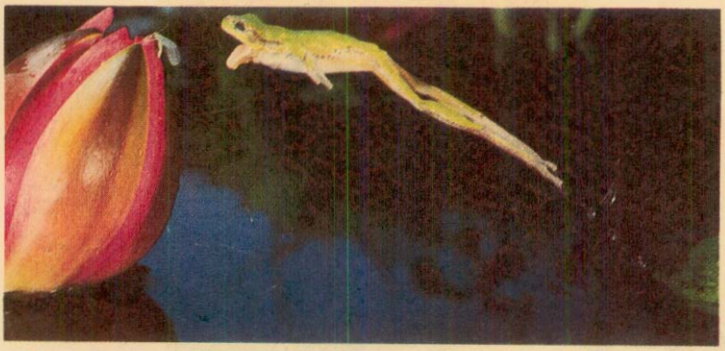

خشکی اور پانی دونوں جگہ رہنے والا برطانیہ کا ایک نایاب مینڈک اپنے شکار پر جھپٹتے ہوئے ۔ جتنی خوبصورت چھلانگ اتنی ہی خوبصورت تصویر

دیکھیں ذرا نظارے جنگل کی زندگی کے

یہ سست ترین زمینی حیوان امریکہ کے بارانی جنگلات میں پایا جاتا ہے۔ زمین پر اس کی رفتار ایک منٹ میں چھ سے آٹھ انچ ہوتی ہے جبکہ درخت پر اس کی رفتار ایک منٹ میں پندرہ فٹ تک ہو جاتی ہے

یہ پہاڑی گوریلے یوگانڈا اور زائر میں پائے جاتے ہیں یہ تقریباً ۵ سے ۸ فٹ لمبے اور ۱۵۰ کلوگرام وزنی ہوتے ہیں

شاہ نواز فاروقی

یہ دُنیا سَن تین ہزار میں

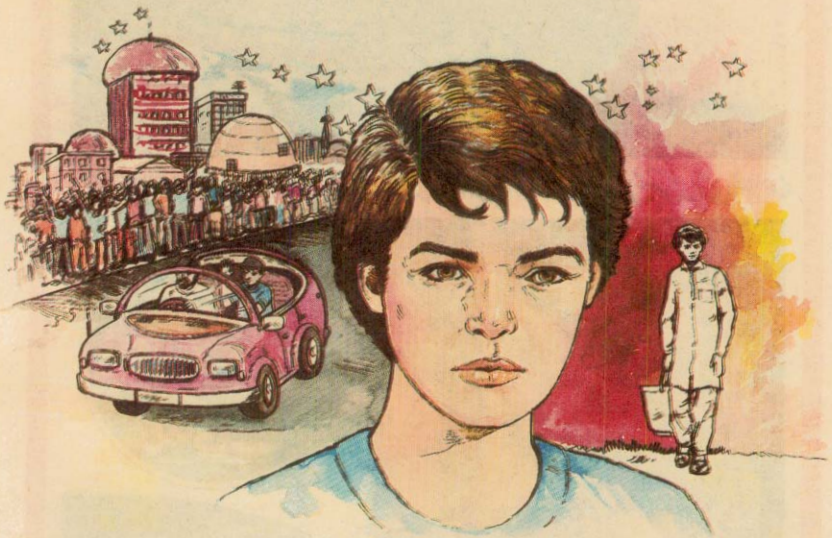

اپنی کئی عادتوں کے حوالے سے ہم بہت مشہور ہیں۔ ہماری ان عادتوں میں سے ایک عادت تخیّل کے گھوڑے دوڑانے کی بھی ہے۔ تنہا ہوں تو یہ عادت شدت کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔ پھر ہم ہوتے ہیں اور تخیّل کا گھوڑا۔ ایسے میں پوری کائنات ہمارے گھوڑے کی زد پر ہوتی ہے۔ ہمارے گھوڑے کی برق رفتاری کا اندازہ اس بات سے کیجئے کہ اس کا پہلا اسٹاپ چندا ماموں ہیں، جہاں یہ گھوڑا پلک جھپکتے میں پہنچ جاتا ہے۔

برق رفتاری کے علاوہ اس گھوڑے کی کئی اور خصوصیات ہیں۔ مثال کے طور پر اسے ایک ملک سے دوسرے ملک میں جانے کے لئے کسی قسم کی اجازت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ نہ یہ گھاس کھاتا ہے اور نہ لات مارتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ یہ کسی کو نظر نہیں آتا۔ تخیل کے گھوڑے کی انھی خصوصیات کے باعث ہمارا دل چاہتا ہے کہ ہم تخیل کے گھوڑوں کا ایک پورا اصطبل رکھیں۔ مگر کیا کریں ہمارا دماغ

بہت چھوٹا ہے۔

کل شام ہمارے گھر والے ایک شادی میں شرکت کے لئے گئے ہوئے تھے۔ گھر والوں نے بڑی کوشش کی کہ ہم بھی ان کے ساتھ چلیں مگر ہمیں شادیوں میں جانے کا ذرا سا بھی شوق نہیں۔ البتہ جنازوں میں شریک ہو کر ہمیں بڑی خوشی ہوتی ہے۔ ویسے ہمارے گھر والے بتاتے ہیں کہ اب شادیوں اور جنازوں کی تقریبات میں صرف اتنا فرق رہ گیا ہے کہ شادی میں لوگ زبردستی خوش ہوتے ہیں اور جنازوں میں زبردستی غمگین، مگر چونکہ ہمیں گھر والوں کی باتوں کا یقین نہیں ہے اس لئے ہم نے شادی میں جانے سے صاف انکار کر دیا ہے۔

گھر کو سونا محسوس کرتے ہی جھینگروں نے راگ الاپنے شروع کر دیئے۔ ہم بستر پر دراز ہو کر ان کے راگوں میں کھو گئے۔ تھوڑی دیر بعد کمرے کی روشنی اور دیواروں کا احساس مٹ گیا۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ہم تخیّل کے گھوڑے پر سوار ہو چکے تھے۔

یوں تو تخیل کا گھوڑا ہمیشہ ہی تیز رفتار ہوتا تھا مگر آج اس کی رفتار ہمیشہ سے زیادہ تیز تھی۔ شاید یہ جھینگروں کے راگوں کا اثر تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہمارا گھوڑا نظام شمسی کو پار کر گیا۔ اب اس کا رخ بے نام کہکشاؤں کی طرف تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم بے نام کہکشاؤں کو بھی پیچھے چھوڑ چکے تھے۔ ہم نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو یہ کہکشائیں ہمیں ایک روشن غبار کی طرح نظر آ رہی تھیں۔ اب ہم مکمل طور پر تاریک فضا میں پرواز کر رہے تھے۔ ہم اس سے پہلے کبھی اتنی دور نہیں آئے تھے۔ تاریکی لمحہ بہ لمحہ گہری ہوتی جا رہی تھی۔ تاریکی کے ساتھ ساتھ ٹھنڈ میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ پھر یہ ٹھنڈ نمی میں بدل گئی اور ہم پورے بھیگ گئے۔ اس صورت حال سے ہم تھوڑی دیر کے لئے پریشان ہوئے اور ہم نے سوچا کہ اپنے گھوڑے کا رخ زمین کی طرف موڑ لیں مگر چونکہ انجانے سفر سے ہمیں مزا بھی آ رہا تھا اس لئے ہم نے گھوڑے کو آگے بڑھنے دیا۔

یکایک ہمیں اپنے سامنے کچھ فاصلے پر روشنی کا ایک ہالہ سا نظر آیا۔ ہم گھوڑے پر سنبھل کر بیٹھ گئے اور سوچنے لگے کہ روشنی کا یہ ہالہ کیا ہے، خیال آیا کہ کہیں یہ جنت تو نہیں؟ اس خیال کے آتے ہی دل خوش ہو گیا۔ اور ہمیں اپنے تمام اچھے اعمال یاد آ گئے۔ مگر پھر خیال گزرا کہ کہیں یہ جہنم ہی نہ ہو۔

"تو کیا ہم جیتے جی جہنم میں جا رہے ہیں۔" جہنم کے احساس کے ساتھ ہی ہمیں اپنی تمام برائیاں یاد آ گئیں۔ ہمیں جھرجھری آ گئی اور ہم نے آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحوں بعد ہم نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ سامنے ایک بڑا سا بورڈ ہے جس پر روشن الفاظ میں لکھا ہوا ہے۔

"خوش آمدید ..... آپ شہرِ مستقبل کی حدود میں داخل ہوچکے ہیں" یہ عبارت پڑھتے ہی ہمیں اپنے جنت اور دوزخ والے خیال پر ہنسی آگئی۔ ہماری مدھم ہنسی خاموش فضاؤں میں دور تک گونج گئی تخیل کے گھوڑے نے گردن گھما کر ہمیں حیرت سے دیکھا ہمیں مسکراتا دیکھ کر وہ بھی مسکرا دیا۔ اس کے اوپر کے دو دانت ٹوٹے ہوئے تھے۔ جس سے ہمیں اس کی بزرگی کا اندازہ ہوا۔

اب ہم "شہرِ مستقبل" کے اوپر پرواز کر رہے تھے۔ ہمارے گھوڑے نے اب اپنی رفتار بہت آہستہ کرلی تھی۔ نیچے ہمیں پیالہ نما گاڑیاں اور چھوٹے چھوٹے قد کے انسان ادھر ادھر آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک سنسان گلی میں ہم نے اپنے گھوڑے کو اتار لیا اور فوراً ہی اسے آرام کرنے کے لئے ذہن کے اصطبل میں باندھ دیا۔ پھر ہم شہر میں گھومنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔

اب تک ہمیں کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن جیسے ہی ہم ایک چوراہے پر آئے متعدد لوگوں کی نظریں ہم پر پڑیں۔ کچھ تو ہمیں دیکھتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے جب کہ کچھ ہمیں دیکھتے ہی بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ البتہ چند لوگ حیرت سے منہ کھولے دھیرے دھیرے چلتے ہوئے ہمارے پاس آئے۔ چند لمحوں تک وہ ہمیں اور ہم ان کو گھورتے رہے۔ پھر ان میں سے ایک نے پوچھا۔

"آپ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟" ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ان صاحب نے ہم سے یہ سوال اردو میں پوچھا تھا۔ اچانک یاد آیا کہ شہرِ مستقبل کا وہ روشن بورڈ بھی اردو میں لکھا ہوا تھا۔ ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ انہیں کیا جواب دیں۔ ہمیں خاموش دیکھ کر ان صاحب نے دوبارہ کہا۔

"آپ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟"

"ہم شاہنواز فاروقی ہیں، ہم ....."

"تو ہمارا خیال درست نکلا ....." ان صاحب نے ہمارا جملہ مکمل ہونے سے قبل انتہائی خوش ہوتے ہوئے کہا۔ پھر وہ آگے بڑھے اور نہایت عقیدت کے ساتھ ہم سے لپٹ گئے۔ ان کے گلے سے لگے لگے ہم نے آس پاس نظر دوڑائی تو دیکھا کہ کافی بھیڑ جمع ہوچکی ہے اور ہر شخص کے چہرے پر خوشی رقص کر رہی ہے۔

وہ صاحب ہم سے الگ ہوئے تو ہم نے پوچھا

"معاف کیجئے گا ہماری سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ سب کیا ہے؟"

"جناب ہم آپ کو پہچان گئے ہیں آپ شاہنواز فاروقی ہیں۔ سن دو ہزار کے عظیم شاعر،

ادیب، مفکر' ارے صاحب آپ کیا نہیں تھے۔ آپ تو پوری دنیا کا عظیم سرمایہ ہیں۔"

"مگر....." ہم نے کچھ کہنا چاہا۔

"ارے صاحب اگر مگر کو چھوڑیئے ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم نے آپ کو دیکھا میری خوش قسمتی کہ میں آج یہاں ایک تقریب کی صدارت کی غرض سے یہاں آیا ہوا تھا۔"

اس کے بعد وہ صاحب ہمیں ہاتھ سے پکڑ کر تقریباً کھینچتے ہوئے اپنی پیالہ نما کار میں بٹھا کر اپنے گھر کی سمت لے چلے۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی انہوں نے اس میں لگے ہوئے کمپیوٹر کے کچھ بٹن دبائے اور گاڑی چل پڑی۔ اس گاڑی کا کوئی ڈرائیور نہیں تھا۔ اگرچہ ہم ابھی تک حیرت اور پریشانی میں مبتلا تھے مگر پھر بھی ہم نے اپنے ہوش بحال کر کے پوچھا۔

"یہ آپ نے بٹن دبا کر کیا کیا ہے؟"

"میں نے گاڑی کے کمپیوٹر کو اپنے راستے اور منزل کے کوڈ نمبر فیڈ کئے ہیں۔ اب میری گاڑی فیڈ کئے ہوئے راستوں پر چلتی ہوئی گھر پہنچ کر خود بخود رک جائے گی۔"

"آپ لوگ کافی ترقی کر گئے ہیں" ہم نے ان سے شاباش والے لہجے میں کہا۔

"جی ہاں! مگر آپ کے زمانے والی بات اس زمانے میں کہاں؟"

انہوں نے کہا جس پر ہم دل ہی دل میں شرمندہ ہوئے۔

گاڑی تیز رفتاری کے ساتھ اپنی منزل کی جانب رواں تھی۔ اچانک ان صاحب نے گاڑی میں لگے ہوئے ٹی وی کو آن کر دیا۔ جس پر یہ اعلان نشر ہو رہا تھا۔

"سن دو ہزار کے عظیم شاعر، ادیب اور مفکر جناب شاہنواز فاروقی شہر ماضی سے نکل کر شہر مستقبل میں آ گئے ہیں۔ اس وقت وہ پاکستان کے صوبے بھارت کے گورنر جناب عبداللہ کے ساتھ ان کی گاڑی میں سوار ہو کر گورنر ہاؤس کی طرف جا رہے ہیں۔" اعلان سن کر ہم مسکرا دیئے۔ ہمیں مسکراتا دیکھ کر عبداللہ صاحب بھی مسکرا دیئے۔ اور بولے۔

"اب ذرائع ابلاغ اتنے ترقی یافتہ ہو چکے ہیں کہ پانچ منٹ کے اندر آپ کی آمد کی اطلاع دنیا کے ایک ایک گھر میں پہنچ چکی ہوگی۔"

کوئی پانچ منٹ کے بعد ہماری پیالہ نما کار جس میں پانچ آدمیوں نے بیٹھنے کی گنجائش تھی گورنر ہاؤس میں داخل ہوئی۔

یہ تین کمروں اور ایک چھوٹے سے لان پر مشتمل ایک گھر تھا۔ جس پر کوئی پہریدار موجود نہیں تھا۔ ہمیں اس بات پر بڑی حیرت ہوئی۔ چنانچہ ہم نے کہا۔

"ٹی وی کی اطلاع کے مطابق آپ ایک بڑے عہدیدار ہیں مگر آپ کا گھر تو بہت چھوٹا دکھائی دیتا ہے۔ اور آپ کے گھر پر کوئی پہریدار بھی نہیں ہے۔"

"جی ہاں" عبداللہ صاحب مسکراتے ہوئے بولے "دراصل اب حقیقی مساوات" کا زمانہ ہے۔ اب گھروں سے زیادہ انسانوں کی اہمیت ہے ۲۰۵۰ کی عالمی جنگ کے بعد کسی انسان کو دوسرے انسان سے کوئی خطرہ نہیں رہا۔ صدیاں گزریں اس زمین پر کسی انسان نے کسی انسان کو ہلاک نہیں کیا۔ اس لئے اب کسی انسان کو پہریدار کی ضرورت نہیں رہی۔ یہی وجہ ہے کہ اب اس دنیا میں پولیس اور فوج نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ ہمارے پاس اب کوئی جنگی ہتھیار نہیں ہے ایک پستول تک نہیں۔"

"بھلا آج کل کون سا سن چل رہا ہے" ہم نے معلومات کے لئے پوچھا

"تین ہزار چالیس" عبداللہ صاحب نے جواب دیا۔

اب ہم عبداللہ صاحب کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ گھر میں ہم دونوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ یا تو عبداللہ صاحب کے بیوی بچے نہیں تھے یا وہ کہیں گئے ہوئے تھے اچانک ہمیں یاد آیا کہ ٹی وی نے ہماری آمد کے اعلان کے ساتھ کہا تھا کہ ہم اس وقت پاکستان کے صوبے بھارت میں موجود ہیں۔ چنانچہ ہم نے پوچھا

"صاحب یہ پاکستان کے صوبے بھارت کے کیا معنی ہوئے" ہماری بات سن کر عبداللہ صاحب مسکرائے۔

"صاحب اب پوری دنیا نے اپنا نام پاکستان رکھ لیا ہے۔ ۱۸۰ ممالک جو کبھی علیحدہ علیحدہ ممالک تھے اب پاکستان کے صوبے بن چکے ہیں۔ مگر یہ سب دنیا کے تمام انسانوں کی متفقہ رائے سے ہوا ہے کسی دباؤ کے تحت نہیں۔ اس وقت پوری دنیا کی ایک ہی کرنسی ہے۔ اور ہر انسان بیک وقت پوری دنیا کا شہری ہے۔"

"مگر یہ واقعہ کب اور کیسے رونما ہوا"

"۲۰۹۵ میں روبوٹوں نے انسانوں کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ انسانوں نے اس بغاوت کو بری طرح کچل دیا اور اس کے بعد انسانی ڈھانچے والے تمام روبوٹ فنا کر دیئے گئے تھے۔ اب انسانی ڈھانچے والے روبوٹ بنانا اس زمین کا سب سے بڑا جرم ہے۔ دراصل ۲۰۹۵ میں دنیا کے ۹۵ فیصد لوگ مسلمان ہو چکے تھے۔ اس لئے پوری دنیا کو ایک ملک میں تبدیل کرنے کی تحریک بہت جلد کامیاب ہو گئی۔ اس وقت اللہ کے فضل سے دنیا کی کل آبادی کا ۹۸ فیصد مسلمانوں پر مشتمل ہے۔" عبداللہ صاحب نے جواب دیا۔

ہمارے اندازے کے مطابق ہمیں اس وقت اس شہر میں آئے ہوئے بارہ گھنٹے کے قریب ہو چکے تھے مگر سورج ابھی تک نکلا ہوا تھا۔ اور دور دور تک شام کے آثار نہیں تھے۔ ہم نے عبداللہ صاحب سے پوچھا۔

"کیا اب آپ کے یہاں رات نہیں ہوتی!"

"ہوتی ہے مگر تین ماہ تک ہمارے اس صوبے میں رات نہیں ہوگی"

"مگر کیوں؟" ہم نے حیرت سے پوچھا

"دراصل اس برس ہمارے صوبے میں دو چوریوں کے واقعات ہوگئے ہیں چنانچہ سزا کے طور پر مرکزی حکومت نے آئندہ تین ماہ تک ہمیں رات سے محروم کر دیا ہے۔"

"مگر یہ کس طرح ممکن ہے؟" ہم نے پوچھا۔

"جناب انسان ایسے آلے تیار کر کے خلا میں بھیج چکا ہے جن کی مدد سے آپ زمین کے جس خطے کو جب تک چاہیں مسلسل رات یا مسلسل دن میں رکھ سکتے ہیں۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ اس وقت رات کے آٹھ بج چکے ہیں۔"

چند منٹ بعد ہم رات کے کھانے کے لئے میز پر موجود تھے۔ میز پر کھانوں کے بجائے پلیٹوں میں مختلف رنگوں کی گولیاں رکھی ہوئی تھیں۔

"یہ کیا ہیں؟" ہم نے گولیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ مختلف سبزیوں اور غذاؤں کے جوس سے بنی ہوئی گولیاں ہیں۔ آپ انہیں چوسیں گے تو اصلی سبزیوں اور غذاؤں کا ذائقہ محسوس کریں گے۔"

ہم نے ایک گولی اٹھا کر منہ میں رکھی تو ہمیں مرغی کے سوپ کا ذائقہ محسوس ہوا۔ دوسری گاجر کے ذائقہ کی حامل تھی۔ باقی گولیاں بھی اسی طرح مختلف سبزیوں کے ذائقوں سے لبریز تھیں۔

"دراصل اب ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ ہم کھانا تیار کرنے میں اپنا وقت ضائع کریں" عبداللہ صاحب نے ایک گولی چوستے ہوئے کہا۔

کھانے کے بعد ہم دوبارہ ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ عبداللہ صاحب نے کھڑکیوں کے موٹے موٹے پردے گرا دیئے جس سے ڈرائنگ روم میں رات کا سماں ہو گیا۔

ہم دونوں رات بارہ بجے تک بیٹھے ہوئے گفتگو کرتے رہے۔ عبداللہ صاحب کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ دنیا کتنی ترقی کر گئی ہے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ دنیا میں اب گاڑیاں وغیرہ پٹرول کے بجائے پانی سے چلتی ہیں۔ سائنس دانوں نے ایسا محلول تیار کر لیا ہے۔ جس کی ایک مخصوص مقدار پانی میں ملانے سے پانی

پٹرول کی خاصیت کا حامل ہو جاتا ہے۔ اس وقت دنیا میں تمام سڑکیں پلاسٹک کی بن چکی تھیں۔ گھر اور تمام استعمال کی اشیاء بھی پلاسٹک سے تیار ہو رہی تھیں چاند اور مریخ پر ہزاروں انسان آباد ہو چکے تھے۔ چاند اور مریخ کے لئے دنیا کے مختلف صوبوں سے ہر روز خلائی جہاز کی ایک پرواز روانہ ہوتی تھی زمین سے چاند تک کا سفر آٹھ گھنٹے کا اور مریخ کا سفر ۱۸ گھنٹے کا تھا۔

اگلی صبح یعنی سونے کے آٹھ گھنٹے بعد ہم اٹھے تو عبداللہ صاحب نے بتایا کہ آج آپ کو قومی عجائب گھر کی سیر کرائی جائے گی۔ ہم بڑے خوش ہوئے کیونکہ ہمیں امید تھی کہ میوزیم میں ہمارے عظیم افکار کی حامل کتابیں ضرور محفوظ ہوں گی۔

ناشتے کے بعد ہم گورنر صاحب کی کار میں بیٹھ کر قومی عجائب گھر کی طرف روانہ ہوئے تو سڑکوں کے دونوں جانب کھڑے ہوئے بے شمار لوگوں نے ہمارا استقبال کیا۔ عبداللہ صاحب نے بتایا کہ گزشتہ بارہ سو برسوں میں یہ پہلا موقع ہے کہ عوام نے سڑکوں پر آکر کسی کا استقبال کیا ہے۔ ورنہ اب دنیا میں بڑے لوگوں کے استقبال کا یہ انداز کتابوں میں محض کہانیوں کے طور پر موجود رہ گیا ہے۔

عجائب گھر کے ایک حصے میں واقعی ہماری درجنوں کتابیں محفوظ تھیں۔ آنکھ مچولی کے کئی شمارے بھی وہاں رکھے ہوئے تھے۔ ہم نے وہ انسائیکلو پیڈیا بھی دیکھا جس میں ہمارے حالات زندگی اور کارناموں کو کئی سو صفحات میں تفصیل سے درج کیا گیا تھا۔ انسائیکلو پیڈیا میں ان سازشوں کا تذکرہ بھی تفصیل سے کیا گیا تھا جو ہمارے زمانے میں ہمیں نوبل انعام سے محروم رکھنے کے سلسلے میں پاکستان مخالف لابی نے کی تھیں۔ ہمیں بتایا گیا کہ آج بھی ہماری شاعری وہاں کے کالجوں اور جامعات میں کلاسیکل شاعری کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ ہم کئی گھنٹے تک قومی عجائب گھر کی سیر کرتے رہے۔ عبداللہ صاحب ہمیں عجائب گھر میں چھوڑ کر اپنے دفتر جا چکے تھے اس لئے واپسی میں ہمیں ایک سرکاری اہل کار نے کار میں عبداللہ صاحب کے گھر چھوڑا۔

راستے میں میں نے ان صاحب سے پوچھا۔

"جناب یہاں کہیں آس پاس سگریٹ کی دکان ہوگی؟ بڑی طلب محسوس ہو رہی ہے۔"

"کیا کہا صاحب؟" ان صاحب نے تقریباً اچھلتے ہوئے کہا

"کہیں آس پاس سگریٹ کی دکان ہوگی" ہم نے فقرہ دہرایا

"آہستہ بولئے صاحب کسی نے سن لیا تو غضب ہو جائے گا۔"

"مگر کیوں؟"

"صاحب، آٹھ سو برس سے زمین پر سگریٹ پینا انتہائی سنگین جرم ہے۔ تقریباً کسی

کے قتل کے برابر، جس کی سزا ناقابل بیان ہے۔"

"دنیا کتنی بدل گئی ہے" ہم نے گہرا سانس لے کر کہا۔

عبداللہ صاحب کے گھر پہنچے تو دیکھا کہ ان کے ڈرائنگ روم میں اس روز کے کئی اخبار میز پر موجود تھے۔ سب اخبار پلاسٹک کے باریک صفحات پر چھپے ہوئے تھے۔ تمام اخبارات میں ہمارے ماضی سے مستقبل میں آنے کی خبریں شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئی تھیں۔

اخبارات پڑھنے کے بعد کچھ بوریت محسوس ہوئی تو ہم گھومنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ گھومتے گھومتے ایک مارکیٹ کے قریب پہنچے یکایک ہماری نظر ایک دکان کے بورڈ پر پڑی لکھا تھا۔

"خوشی کی دکان"

"میرے خدا کیا یہاں خوشی فروخت ہوتی ہے؟" ہم نے سوچا

دروازہ کھول کر ہم دکان میں گئے۔ دکاندار ہمیں دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا اور بڑے زبردست طریقے سے اس نے ہمارا استقبال کیا۔

"بھائی کیا آپ کی دکان پر خوشی فروخت ہوتی ہے؟"

"جی ہاں یہی سمجھ لیجئے"

"کیا مطلب؟"

"ہم ایسی گولیاں فروخت کرتے ہیں جنہیں کھا کر انسان کا غم دور ہو جاتا ہے اور وہ اپنے اندر خوشی کی کیفیات محسوس کرنے لگتا ہے۔ گو ایک گولی کا اثر صرف چھبیس گھنٹے تک رہتا ہے۔"

اسی اثناء میں ایک شخص دکان میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے سے پریشانی صاف جھلک رہی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

"خوشی کی چار گولیاں عنایت کیجئے" اس شخص نے دکان دار سے کہا۔ پھر اس نے ایک گولی لے کر فوراً ہی چوسنی شروع کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے چہرے کی کیفیات بدلنے لگیں۔ چند ہی منٹوں میں وہ مسکرا رہا تھا۔ ہم حیرت سے یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔

گھر واپس ہوئے تو عبداللہ صاحب ہمارے منتظر تھے۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ مرکزی حکومت نے آج رات ہمارے اعزاز میں ایک پر تکلف عشائیے کا اہتمام کیا ہے۔

"اب ہمیں واپس جانا ہے"

"کل چلے جائیے گا" عبداللہ صاحب نے اصرار کیا

"دراصل ہمیں ایک بے حد ضروری کام یاد آ گیا ورنہ ہم ضرور رک جاتے"

"ایسا کیا کام ہے؟"

"بس کچھ ایسا ہے کہ ہم آپ کو بتا نہیں سکتے"

عبداللہ صاحب نے بہت اصرار کیا مگر ہم واپسی پر مجبور تھے۔ بالآخر عبداللہ صاحب ہماری بات مان گئے۔ انہوں نے بڑی محبت کے ساتھ ہمیں رخصت کیا۔ وہ بہت سارے تحفے ہمیں دے رہے تھے مگر ہم نے وزن کے خیال سے معذرت کرلی۔ چند ہی لمحوں بعد ہم اپنے تخیل کے گھوڑے پر سوار ہو کر واپسی کا سفر اختیار کر چکے تھے۔

ابھی ہمیں چلے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ ہمیں کھڑ کھڑاہٹ سنائی دی۔ ہم نے آس پاس دیکھا مگر کچھ بھی نظر نہ آیا۔ چند لمحوں بعد وہی کھڑ کھڑاہٹ پھر سنائی دی۔ اس بار ہم نے اپنے گھوڑے کا جائزہ لیا مگر اس کے تمام جسمانی اعضاء صحیح سلامت تھے۔

"زندہ ہو یا مرچکے ہو" یکایک آواز آئی۔

ہمیں لگا جیسے ہمارے بڑے بھائی ہمارے سامنے کھڑے ہوں۔

"آپ جو کوئی بھی ہیں تمیز سے بات کیجئے۔" ہم نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ ہم پندرہ منٹ سے باہر کھڑے دروازہ پیٹ رہے ہیں مگر آپ ہیں کہ سنتے ہی نہیں۔ لگتا ہے کہ ڈاکٹر کو دکھانا ہی پڑے گا۔"

اب ہمیں احساس ہوا کہ یہ واقعی بھائی صاحب ہیں۔ ہم اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ہمارا گھوڑا صورت حال کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے اپنے اصطبل میں پہنچ چکا تھا۔ بھائی صاحب بڑبڑاتے ہوئے باہر نکلے تو والد صاحب کمرے میں داخل ہوئے انہوں نے ہمیں گھور کر دیکھا اور بولے۔

"پانی نہیں آرہا، جاؤ نلکے سے ایک بالٹی بھر لاؤ"

"آپ لوگ کتنے ظالم ہیں اس آدمی کی قدر نہیں کرتے جو سن تین ہزار میں بھی اپنے عظیم افکار کے باعث زندہ ہے اور جس کو ایک نظر دیکھنا بھی اعزاز کی بات سمجھا گیا" ہم نے شدت کے ساتھ سوچا مگر کہا نہیں۔

چند لمحوں بعد ہم بالٹی ہاتھوں میں تھامے محلے کے نلکے کے پاس بیٹھے تھے۔ بالٹی دھیرے دھیرے بھر رہی تھی ..... ہمارے آنسوؤں سے۔

بارش اور بچے

غلام عباس طاہر

بارش زندگی کے لئے انتہائی ضروری چیز ہے اور جس خطے میں بارش نہ ہو وہاں قحط پھیل جاتا ہے۔ مختلف علاقوں میں بارش مانگنے کے مختلف طریقے ہیں جن میں زیادہ تر بچے اہم کردار ادا کرتے ہیں اس لئے ہم بچوں کے بارش مانگنے کے مختلف طریقوں پر نظر ڈالتے ہیں۔

جنوب مغربی افریقہ کی قوم "زولو" کی عورتیں اپنے بچوں کو دھوپ میں گردنوں تک زمین میں دفن کر دیتی ہیں تاکہ ان کی یہ حالت دیکھ کر آسمان کا دل رحم سے بھر آئے۔

ہمارے لوگوں کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ بچوں کی فریاد بہت جلد سنتا ہے لہٰذا پنجاب میں دیہاتوں میں خشک سالی کے دنوں میں میٹھے چاول یا دلیہ پکا کر بچوں میں تقسیم کرتے ہیں اور ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ دھوپ میں کھڑے ہو کر اللہ سے دعا مانگیں۔ پسینے میں شرابور بچے اللہ کے سامنے اس طرح سے فریاد

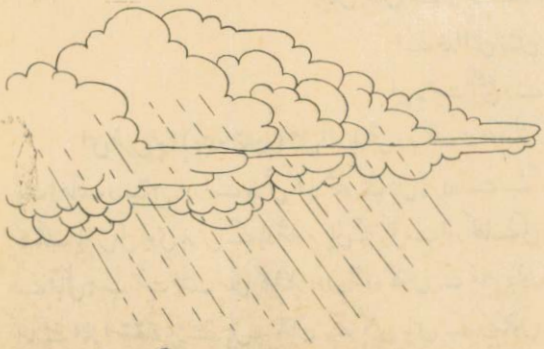

کرتے ہیں۔

"نیچے سے ہمارے پاؤں جل رہے ہیں۔
اوپر سے ہمارا سر جل رہا ہے۔
اے خدا ننھے بچوں کی فریاد سن لے۔
خدایا بارش کر دے، خدایا بارش کر دے۔"

پنجاب میں اللہ تعالیٰ کے سامنے بچے یوں بھی ضد کرتے ہیں۔

"چاہے ہم بھاگتے بھاگتے گھس ہی کیوں نہ جائیں جب تک بارش نہ ہوگی گھروں کو نہ لوٹیں گے۔"

آسمان کے سامنے یہ چیخ و پکار صرف پنجاب تک محدود نہیں بلکہ ہر اس جگہ جہاں پر خشک سالی ڈیرے ڈال دے اور آبپاشی کے لئے سوائے بارش کے اور کوئی ذریعہ نہ ہو تو وہاں کے بچوں میں یہ عمل خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا یونان میں تھیلی اور مقدونیہ کے لوگوں میں یہ رواج تھا کہ جب عرصے تک بارش نہ ہوتی تو بچوں کا ایک جلوس آس پاس کے کنوؤں اور چشموں پر بھیجا جاتا تھا ایک لڑکی پھلوں سے لدی آگے آگے چلتی جسے ہر منزل پر اس کے ساتھی پانی میں بھگو کر شرابور کرتے جاتے اور ساتھ ہی گاتے جاتے۔

جنگل پہاڑ شاہراہ
جہاں جہاں سے تو گزرے، یہ دعا کرتی جا
اے خدا اس زمین پر
ابرِ رحمت بھیج دے۔

اسی طرح پونا (ہندوستان) میں اگر بارش دیر تک نہ ہو تو لڑکے اپنے کسی ساتھی کو ننگا کر کے پتوں سے ڈھانک دیتے ہیں اور اسے بارش کا بادشاہ کہتے ہیں پھر وہ اسے لے کر گاؤں میں گھر گھر پہنچتے ہیں۔ گھر کا مالک یا اس کی بیوی بارش کے بادشاہ پر پانی چھڑکتی ہے اور کھانے کی چیزیں پیش کرتی ہے۔ صوبہ سرحد کے قبائلی جب سخت خشک سالی کا شکار ہوں تو وہ گاؤں کے تمام جانوروں کو ایک جگہ اکٹھا کر کے ان کے سامنے نماز استسقاء پڑھتے ہیں۔ ملتان کے آس پاس کے دیہاتوں کے کسان ایک بھورے رنگ کے مکوڑے کو پکڑ کر کنویں کے مٹی کے لوٹے کے ساتھ باندھ دیتے ہیں اور کالی گدھی کو کنویں کے آگے جوت کر اسے سات چکر دیتے ہیں۔ مکوڑا جب سات ڈبکیاں لگا کر کنویں سے باہر آتا ہے تو کسان اس بھیگے ہوئے مکوڑے کو آزاد کر دیتے ہیں۔ ان کا یہ خیال ہوتا ہے کہ بھیگے ہوئے مکوڑے کو جب گرمی لگتی ہے تو وہ بارش کے لئے دعا مانگتا ہے۔ پوٹھوہار میں خشک سالی کے دنوں میں یوں ہوتا ہے کہ مٹی کا ایک گھڑا

لے کر اس میں بدبو دار گندی چیزیں ڈال کر اسے دیوار کے اوپر سے کسی کے گھر میں پھینک دیا جاتا ہے صاحب خانہ خوب گالیاں بکتا ہے اور یوں بارش ہونے کی امید بندھ جاتی ہے۔ خشک سالی کے دنوں میں پنجاب کے دیہاتوں کی گلیوں میں بارش کے لیے اچھلتے کودتے بچوں کے جلوس کے آگے ایک ایسا بچہ بھاگ رہا ہوتا ہے جس کے چہرے پر سیاہی ملی ہوتی ہے گویا یہ بچہ بادلوں کا دیوتا ہوتا ہے جسے اس کے ساتھی روڑے کے نام سے پکارتے ہیں

کالیاں اٹاں کالے روڑ (کالی انٹیں کالے کنکر)

مینہ وسادے زور و زور (مینہ برسادے زور زور سے)

صوبہ سرحد کے بچے بھی روڑے والے جلوس سے ملتا جلتا ایک جلوس نکالتے ہیں جسے وہاں کے لوگ اللہ ہو کہتے ہیں۔ اس جلوس کے آگے دو بچے ہوتے ہیں ان کے چہروں پر سیاہی ملی ہوتی ہے دیہات کے لوگ انہیں کھانے پینے کی چیزیں دیتے ہیں جو وہ تمام گاؤں کا چکر کاٹنے کے بعد ایک جگہ بیٹھ کر کھا جاتے ہیں اور اللہ کے حضور بارش کی دعا مانگتے ہیں پنجاب کے دیہاتوں میں شریر بچوں کا یہ جلوس جس کا لیڈر روڑا ہوتا ہے بارش حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کی شرارتیں کرتا ہے۔ جلوس کے شرکاء درختوں پر چڑھ کر کوؤں کے انڈے اتارتے ہیں اور ان انڈوں کو سیاہ گدھی کے سر میں پھوڑتے ہیں تو کائیں کائیں کرتے ہوئے بے شمار کوّے شریر بچوں کے سر پر ٹھونگیں مارنے کو دوڑتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس طرح بارش آنے کی امید بندھ جاتی ہے۔

لطیف اور سوٹ

ایک درزی کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ سوٹ سیتے وقت کپڑا بہت چراتا ہے۔ ایک صاحب نے اپنے دوستوں سے کہا کہ میں اس درزی سے سوٹ سلواؤں گا اور دیکھوں گا کہ کیسے یہ کپڑا چرائے گا؟ وہ سوٹ کا کپڑا لے کر درزی کے پاس گئے اور وہیں بیٹھ گئے اور کہنے لگے تم میرے سامنے سوٹ کاٹو درزی پہلے تو پریشان ہوا پھر سوٹ کاٹنے لگا۔ سوٹ کاٹتے ہوئے اس نے ان صاحب کو ایک مزیدار لطیفہ سنایا۔ وہ صاحب قہقہہ لگاتے ہوئے سر کو ذرا پیچھے کی طرف لے گئے۔ اسی وقت درزی نے تھوڑا سا کپڑا کاٹ لیا ان صاحب کو پتا نہ چل سکا۔ پھر درزی نے ایک اور لطیفہ سنایا اور جیسے ہی ان صاحب کا سر پیچھے ہوا درزی نے کپڑا پھر کاٹ لیا۔ وہ صاحب بولے "یار تم نے لطیفے تو بہت عمدہ سنائے کوئی اور سناؤ" درزی بولا "جناب اب میں مزید کوئی لطیفہ نہیں سنا سکتا"۔ وہ صاحب بولے کیوں؟ درزی بولا "اس لئے کہ اگر کوئی اور لطیفہ سنایا تو آپ کا سوٹ چھوٹا پڑ جائے گا۔"

ارم حسن راولپنڈی

بچپن کی یادیں

عمارہ، گرین ٹاؤن، لاہور

ابھی صندوق کھولا جس میں میرے بچپنے کی چند یادیں ہیں
یہ اک خاموش سی گڑیا
کہ جس کے سنگ بچپن میرا گزرا ہے
بہت باتیں بھی کی ہیں، اور اس کے ساتھ سوئی ہوں
یہ اک چھوٹا سا جھمکہ جو کبھی میں دیکھ کر کے مسکراتی، اور کہتی تھی
مری گڑیا تجھے جس روز میں دلہن بناؤں گی، سجاؤں گی
تو یہ جھمکہ پہن کر کے میں بھی تیرے ساتھ بیٹھوں گی
یہ اک چھوٹی سی انگوٹھی
جو میری اک سہیلی نے کبھی مجھ کو دلائی تھی،
نشانی لے کے اس کی میں نے اپنے پاس رکھی تھی
اسی صندوق میں نیچے، یہ اک سگرٹ کا ٹکڑا ہے
جو میں نے اپنے ابا سے چھپا کر رکھ لیا تھا
میں سگرٹ سے بہت بے زار رہتی تھی
چلم دادا کے حقے کی، یہ کچھ چوپال کی مٹی
کہ جس میں کھیلتی تھی میں،
یہ مٹی ایک دن یوں ہی فرش سے میں نے کھرچی تھی
مجھے دادی نے ڈانٹا تھا، کہا تھا، "دوڑ کر جاؤ اسے تم پھینک کر آؤ"
مگر میں نے اسے ضد میں، اسی صندوق میں رکھا۔
نہیں معلوم تھا مجھ کو
یہ اک دن یوں، مرے بچپن کے افسانے کا کوئی باب لکھے گی
مگر اب کچھ نہیں باقی، یہ کچھ یادیں ہیں سپنے ہیں، اور اب میں نے یہ سوچا ہے
انہیں بھی آنسوؤں کے سنگ اس صندوق میں رکھوں، کہو کیا ٹھیک سوچا ہے؟

الیکٹرونی دماغ
کمپیوٹر

ساجدہ سعید

اگر موجودہ دور کے بارے میں یہ کہا جائے کہ یہ دور کمپیوٹر کا دور ہے تو یہ کہنا بے جا نہ ہو گا یوں تو سائنس کی کاوشوں کے نتیجے میں ایسی بہت سی ایجادات وجود میں آچکی ہیں جنہوں نے انسانوں کے لئے بہت سی سہولتیں پیدا کی ہیں۔ خلاؑ کی دنیا سے لے کر زمین کے سربستہ رازوں تک انسان نے اب تک بہت کچھ پتا لگانے کی کوشش کی ہے۔ ایک طرف سائنس نے انسانوں کے لئے جہاں بہت سے وسائل پیدا کئے ہیں وہاں دوسری طرف انسانی تباہی کے لئے اس نے بہت سے مہلک ہتھیاروں کے انبار لگا دیئے ہیں جس میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

اگر ہم بیسوی صدی کی سائنسی ایجادات کا جائزہ لیں تو ان سب ایجادات میں کمپیوٹر کی تخلیق سب سے حیرت انگیز نظر آئے گی کیونکہ گزشتہ کچھ سالوں سے کائنات سے لے کر انسان تک ہر مسئلے میں کمپیوٹر

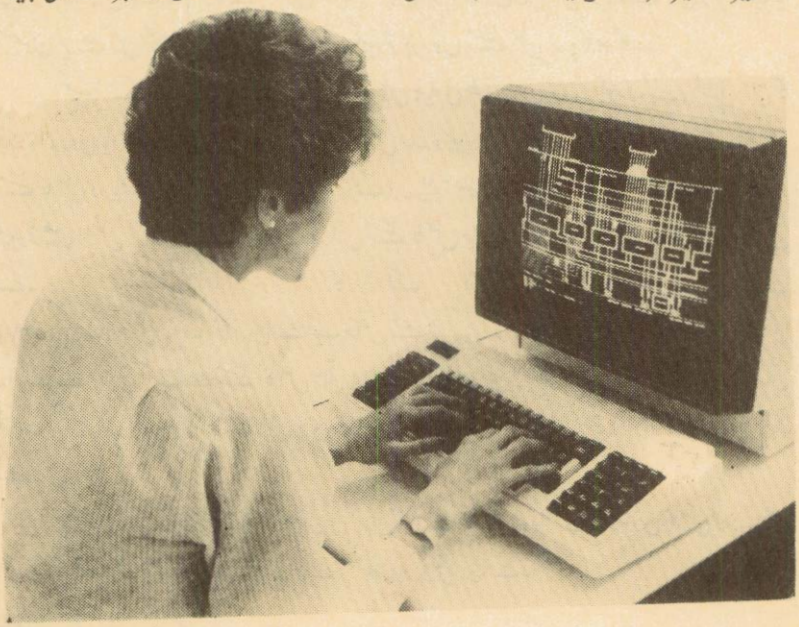

کا خاصا عمل دخل ہے اس لحاظ سے اس کو اس صدی کی حیرت انگیز ایجاد کہنا غلط نہ ہوگا۔

آج سے کوئی پچاس سال پہلے تک کسی کو کمپیوٹر کا نام تک معلوم نہ تھا۔ سترھویں اور انیسویں صدی میں سائنس دانوں نے چند ایسی مشینیں ایجاد کرلی تھیں جو جمع و تفریق کے اصولوں پر کام کرتی تھیں ان ہی سائنس دانوں اور ریاضی دانوں کی تحقیق اور اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ۱۹۴۶ء میں امریکی سائنس دانوں نے ایک ایسی حسابی مشین ایجاد کی جو ایک سیکنڈ میں تین سو مرتبہ ضرب کا عمل کر سکتی تھی اس کا نام اینیاک تھا اس کمپیوٹر کی ایجاد کے بعد ۱۹۵۰ء کے عشرے تک تقریباً دس سے زائد کمپیوٹر دنیا میں متعارف ہو چکے تھے اس وقت کے کمپیوٹر پر کروڑوں روپے لاگت آتی تھی لیکن پھر رفتہ رفتہ سائنس دانوں نے اس میں مزید بہتری پیدا کی اور اس مشین کی کارکردگی کو بہتر بناتے ہوئے اس کو اس طرز پر بنایا کہ نہ صرف یہ بجلی کم لینے لگا بلکہ وہ بیس گنا تیز رفتاری سے کام بھی کرنے لگا۔

کمپیوٹر دراصل ایک مشینی دماغ ہے جو انسان کی ہدایات کے مطابق دی ہوئی معلومات کی روشنی میں ہر مسئلے کا صحیح حل بتاتا ہے آج دنیا بھر کی سائنسی ترقی کا دارومدار کمپیوٹر میں ہے اسی مشین نے انسان کے بہت سے پیچیدہ اور مشکل مسئلوں کو کافی حد تک کم کر دیا ہے۔ دفتروں، اسکولوں، بینکوں، صنعتوں، ہسپتالوں اور تجربہ گاہوں وغیرہ میں یہاں تک کہ کھیل اور ادب کے میدان میں بھی اب کمپیوٹر عام ہے۔ کمپیوٹر بہت تیزی سے کام کرتا ہے برسوں کا کام منٹوں اور سیکنڈوں میں حل کر لیتا ہے جتنی دیر آپ یہ مضمون پڑھنے میں لگائیں گے اتنی دیر میں ایک کمپیوٹر ہزاروں مسئلے حل کر چکا ہوگا۔

کمپیوٹر کے بہت سے حصے ہوتے ہیں جن میں بنیادی طور پر ان پٹ، آؤٹ پٹ، حسابی عمل کا خانہ، اندرونی یادداشت یا (Memory) اور کنٹرول خانہ وغیرہ شامل ہیں۔ مثال کے طور پر آپ کو کسی مسئلے کا حل دریافت کرنا ہے اور وہ آپ کمپیوٹر کے ذریعے معلوم کرنا چاہتے ہیں تو آپ اپنے اس مسئلے کو کمپیوٹر میں داخل کرنے کے لئے ان پٹ اور اس مسئلے کا حل جاننے کے لئے آؤٹ پٹ کا استعمال کریں گے۔ اسی طرح کمپیوٹر کا ایک اہم حصہ اندرونی یادداشت (Memory) ہوتی ہے۔ میموری کے ایک خاص حصے میں کچھ ہدایات ہمیشہ محفوظ رہتی ہیں جو آپ کی ہدایات کے مطابق آپ کے مسئلے کا حل بتاتی ہیں۔ حسابی خانہ بھی کمپیوٹر کا ایک اہم حصہ ہوتا ہے یہاں ضرب، تقسیم اور تفریق وغیرہ کے عمل بڑی تیزی سے کئے جاتے ہیں یہاں مقداروں کا بھی پتا لگایا جاتا ہے۔

کنٹرول خانہ کمپیوٹر کے تمام حصوں کی نگرانی کرتا ہے یہ اپنی یادداشت (میموری) میں محفوظ کیے ہوئے مسئلے کا حل بتانے کے لئے دوسرے حصوں کو سگنل دیتا ہے۔

کمپیوٹر ثنائی نظام کے تحت عمل کرتا ہے آپ نے اپنے کورس کی کتابوں میں ثنائی نظام تو ضرور پڑھا ہوگا جو صفر اور ایک اعداد کے نظام کے مطابق چلتا ہے۔ کمپیوٹر ان ہی دو اعداد کے مطابق ہدایت اور اعداد و شمار کو اپنے اندر جمع کر لیتا ہے یعنی ثنائی نظام کے ذریعے حروف، اعداد اور ہر قسم کی علامتوں کو الیکٹرانی سرکٹوں میں محفوظ کیا جاسکتا ہے۔

کمپیوٹر ایک فرماں بردار نوکر کی طرح آپ کی ہدایات کی روشنی میں کام کرتا ہے۔ یہ انسان کی طرح چالاک اور ذہین نہیں ہوتا اور نہ ہی آپ کی ہدایات کے بغیر کوئی کام کر سکتا ہے۔ اگر آپ اس میں صحیح پروگرام فٹ کریں گے تو یہ صحیح نتیجہ نکالے گا ورنہ غلط کیونکہ یہ ایک الیکٹرانی مشین ہے۔ مختلف نوعیت کے کاموں کے لئے کمپیوٹر میں مختلف زبانیں استعمال ہوتی ہیں جنہیں کمپیوٹر کی زبان کہا جاتا ہے۔ کمپیوٹر اس لحاظ سے مفید ایجاد ہے کہ اس میں بہت کم وقت میں بے شمار طریقوں سے مختلف کام لئے جاتے ہیں۔

ایک عام کمپیوٹر اپنی یادداشتیا میموری میں دس ہزار سے لاکھوں الفاظ ذخیرہ کر سکتا ہے۔ کمپیوٹر کو بند کرتے ہی میموری سے تمام معلومات غائب ہو جاتی ہیں اس لئے ان معلومات کو قائم رکھنے کے لئے مقناطیسی ٹیپ یا ڈسک (disk) ہوتی ہے جو کیسٹ کا کام دیتے ہیں آپ ان کے اندر بہت سی معلومات ذخیرہ کر سکتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر فوراً دوبارہ ان معلومات کو حاصل کر سکتے ہیں۔ اس مقناطیسی ڈسک میں آپ لاکھوں الفاظ یا ہزاروں مضمون کی ضخیم کتاب بھی محفوظ کر سکتے ہیں۔

کمپیوٹر نے جہاں انسان کے بہت سے پیچیدہ مسئلوں کو آسان بنایا ہے وہاں خلائی دنیا میں بھی اس مشین نے بہت سی آسانیاں پیدا کی ہیں کمپیوٹر کی نگرانی میں جہاز صحیح سمت میں سفر کرتے ہیں۔ اربوں کلو میٹر دور خلائی جہازوں سے مسلسل رابطہ رکھنا اور ان کے بھیجے ہوئے پیغامات کا تجزیہ کر کے ان کی واضح تصویریں پیش کرنا کمپیوٹر ہی کا کارنامہ ہے۔ اس وقت سُپر کمپیوٹر دنیا میں سب سے بڑے اور تیز کمپیوٹر ہیں ایک سُپر کمپیوٹر تقریباً چالیس چھوٹے کمپیوٹروں کی طاقت رکھتا ہے اور ایک سیکنڈ میں تقریباً کروڑوں ہدایات پر عمل کرتا ہے۔ درجۂ حرارت، ہوا کی رفتار، دباؤ اور سمت وغیرہ کے بارے میں تازہ ترین معلومات ایک بڑے کمپیوٹر سے با آسانی معلوم کی جاسکتی ہیں۔ اس کے علاوہ جرائم کے ریکارڈ، بینک میں تمام اکاؤنٹوں کی تفصیل، لائبریری کی تمام کتابوں کا ریکارڈ وغیرہ بھی کمپیوٹر سے با آسانی معلوم کیا جاسکتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ کمپیوٹر ایک ماہر معالج کے طور پر مریضوں کا بلڈ پریشر، درجۂ حرارت اور نبض کی رفتار چیک کرتا ہے اور کسی بھی خطرناک صورتحال سے ڈاکٹر کو فوراً آگاہ کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ ادبی میدان میں بھی کمپیوٹر کی مانگ بڑی ہے۔ الغرض کمپیوٹر انسان کی صلاحیتوں کی وہ مثال ہے جس کے انہونی خوبیوں کا شاید قلم احاطہ نہ کر سکے۔

آرٹ کے عجیب و غریب نمونے

سلمیٰ سلیم

برطانیہ کے ایک علاقے میں ایک بہت بڑے گھوڑے کی شبیہ زمین پر بنی ہوئی ہے۔ شبیہ میں گھوڑے کو بھاگتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دو ہزار سال قبل اس علاقے میں کیلز نام کے لوگ آباد تھے۔ یہ شبیہ انہی لوگوں نے بنائی ہے۔ برطانیہ کے لوگوں نے گھوڑے کی اس تصویر کو گھاس پھوس کے اگنے سے بچا کر محفوظ رکھا ہے۔ برطانیہ کے دوسرے کئی علاقوں میں انسانی شبیہیں بھی موجود ہیں۔ خیال ہے کہ یہ شبیہیں گھوڑے کی شبیہ سے بھی زیادہ قدیم ہیں۔

گھوڑے کی یہ شبیہ فٹ بال کے میدان سے بھی زیادہ بڑی ہے۔

کیلی فورنیا کے صحرا میں بھی بہت سادی شبیہیں موجود ہیں۔ ان میں سے کچھ انسانوں کی ہیں اور کچھ تجریدی سی ہیں۔ اس علاقے میں رہنے والے ریڈ انڈینوں نے صدیوں پہلے صحرائی سطح کو ابھار کر یا کھود کر یہ شبیہیں بنائی ہیں۔ خیال ہے کہ ریڈ انڈین ان شبیہوں کے آس پاس اپنی مذہبی رسومات ادا کرتے تھے۔

پیرو میں ایک مقام پر ایک پورا چڑیا گھر موجود ہے۔ اس چڑیا گھر میں وہیل، بندر، مکڑی، چھپکلی اور ہمنگ برڈ جیسے حیوانات موجود ہیں۔ یہ سب حیوانات زمین کھود کر بنائے گئے۔ خیال ہے کہ یہ چڑیا گھر دو ہزار سال پرانا ہے۔

زمین اور صحرا میں بنی ہوئی ان شبیہوں کی تخلیق کے بارے میں مختلف نظریات موجود ہیں لیکن کوئی بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی۔ البتہ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ان کو بنانے والے بہت بڑے تخلیقی ذہن کے مالک تھے۔

کچھ تخلیق کرنے کی خواہش اتنی ہی قدیم ہے جتنا خود انسان۔ تخلیق کی اس خواہش نے انسان کو بے شمار چیزیں تخلیق و ایجاد کرنے پر مائل کیا۔ اس خواہش نے اپنا سب سے زیادہ اظہار آرٹ میں کیا ہے۔

دنیا کے متعدد ممالک میں آرٹ کے ایسے بے شمار نمونے موجود ہیں جن کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں ہے کہ وہ کب اور کیوں تخلیق کئے گئے اور ان کا خالق کون تھا؟ شمالی اور جنوبی امریکہ میں صدیوں پہلے انسانوں نے آرٹ کے بڑے بڑے نمونے تخلیق کئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کا کینوس کاغذ نہیں زمین تھی۔

جدید دور میں آرٹ کے ان نمونوں کی ہوائی جہاز سے تصاویر کھینچی گئی ہیں۔ جس کے باعث ان شبیہوں کا ایک نیا زاویہ ابھر کر سامنے آیا ہے۔ ذیل میں ہم ایسی ہی چند تصاویر کے بارے میں آپ کو بتا رہے ہیں۔

اِن تصویروں کے انداز کھول رہے ہیں کیا کیا راز

ہمنگ برڈ کے یہ پر جمبو جیٹ کے پروں سے پانچ گنا بڑے ہیں

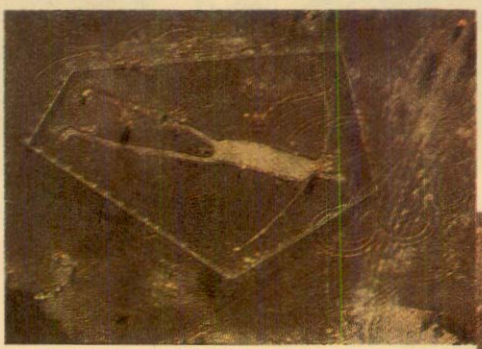

کیلی فورنیا میں زمین پر بنی ہوئی اس شبیہہ کو باڑ لگا کر محفوظ کر دیا گیا ہے ،

یہ شاید ہے بارہ سنگھا

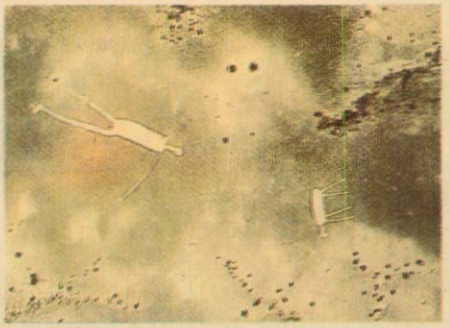

بندر کی یہ شبیہہ اس قدر بڑی ہے کہ اس کے بائیں
پنجے میں اسکول بس آسانی کے ساتھ کھڑی ہو سکتی ہے

پچاس برس قبل جب اس علاقے میں گاڑیاں وغیرہ نہیں آتی تھیں تو شبیہیں عمدہ حالت میں تھیں

یہ تصویریں نئی راہیں سجھاتی ہیں نئے رستے دکھاتی ہیں

محترم خاتون! یہ دُور بین نہیں، مائیکروفون ہے

ہو نہ ہو
یہ جوتا عالم چنّا کا ہوگا

اِس کار اور خاتون پر کہیں کسی
بھوکی گائے کی نظر نہ پڑ جائے

سلیم مغل

آتش فشاں

دہکتی زمینیں، شعلہ اُگلتے پہاڑ

اگر آپ ٹی وی کا خبر نامہ شوق سے دیکھتے ہیں تو پھر آپ نے یقیناً فیلما میں پھٹنے والے اس آتش فشاں کے متعلق بھی ضرور کچھ سنا اور دیکھا ہو گا جو آج کل پوری دنیا کو اپنی جانب متوجہ کئے ہوئے ہے۔ دنیا بھر کے ٹی وی اسٹیشن آئے دنوں اس آتش فشاں کے متعلق کوئی نہ کوئی فلم رپورٹ دکھاتے رہتے ہیں جس نے فلپائن سمیت جنوب مشرقی ایشیا کے قریبی ملکوں کو متاثر کیا ہوا ہے۔ ہمارے اخبارات بھی ان دنوں فلپائن کے پہاڑ پیناٹیبو کے اچانک پھٹنے کی خبریں شائع کر رہے ہیں۔ پہلے تو یہ خبر آئی کہ پندرہ ہزار سے زائد امریکی فوجی، پیناٹیبو کے پھٹتے ہی اپنا اڈہ چھوڑ کر کسی محفوظ مقام کی طرف

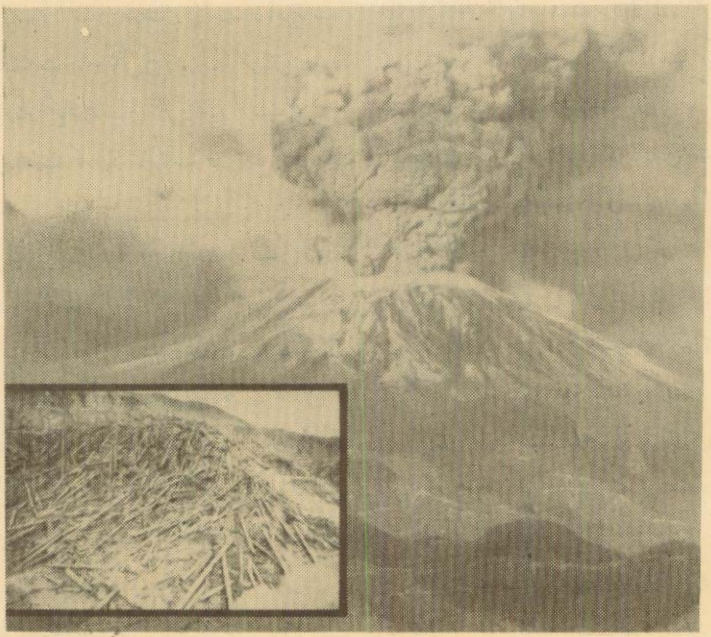

جانکلے۔ پھر ابھی حال ہی میں یہ خبر بھی شائع ہوئی کہ اس آتش فشاں کی وجہ سے تقریباً ۱۰۰ کلو میٹر کے فاصلے پر واقع منیلا ایئرپورٹ کو بند کرنا پڑ گیا ہے۔ آتش فشاں کو انگریزی میں والکینو (Volcano) اور ہندی میں جوالا مکھی کہتے ہیں۔ اتنا تو آپ بھی جانتے ہوں گے کہ آتش فشاں شعلے اگلتے یا آگ برساتے پہاڑوں کو کہتے ہیں، مگر پہاڑوں سے یہ آگ کیوں نکلتی ہے۔ زیر زمین یہ لاوا کیسے پکتا ہے؟ آیئے یہ سمجھنے کی کوشش کریں۔

آپ نے پریشر ککر میں کھانا پکتا ہوا دیکھا ہوگا۔ جلتے ہوئے چولہے پر رکھا ہوا پریشر ککر ایک خاص وقت تک تو آگ کی حدت برداشت کرتا رہتا ہے مگر جب بہت زیادہ تپش کی وجہ سے ککر میں موجود پانی یا دیگر اشیاء بھاپ کی شکل اختیار کرنے لگتی ہیں تو اس بھاپ کا دباؤ خطرناک حد تک بڑھ جاتا ہے۔

پریشر ککر میں دباؤ کو برداشت کرنے کی زیادہ سے زیادہ قوت ساڑھے تین کلو گرام فی مکعب انچ ہوتی ہے مگر یہ دباؤ اس سے زیادہ بڑھ جائے تو پریشر ککر پھٹ بھی سکتا ہے۔ جو یقیناً بڑے نقصان کا باعث ہوسکتا ہے۔ اس خطرے کو ختم کرنے کے لئے پریشر ککر پر سیفٹی والو لگائے جاتے ہیں تاکہ پریشر ککر بڑھنے کی صورت میں سیفٹی والو اڑ جائے اور بھاپ باہر نکل جائے۔

زمین بھی ایک طرح کا پریشر ککر ہے جس کے اندر ہر وقت ایک لاوا کھولتا رہتا ہے اور جب کسی وجہ سے لاوے سے اٹھنے والی بھاپ کا پریشر بہت بڑھ جاتا ہے تو پھر یہ لاوا بھی زمین کے کسی نرم حصے کو چیرتا پھاڑتا ہوا باہر آجاتا ہے۔ زمین کا یہی نرم حصہ گویا آتش فشاں بھی ہے اور زمین کا سیفٹی والو بھی ہے۔

ہم "آتش فشاں" کی تعریف یوں بھی کرسکتے ہیں کہ "زمین کا وہ نرم حصہ جہاں گرم اور سیال مادہ پھوٹ کر اوپر آجائے اور دہانے کے چاروں طرف لاوے کی تہیں جم جانے سے مخروطی شکل اختیار کرلے" آپ یقیناً سوچ رہے ہوں گے یہ "لاوا" کیا بلا ہے؟ جو زمین سے نکلتا ہے اور بستیاں اجاڑتا، انسانوں کو لقمۂ اجل بناتا، اور یوں گویا تباہی مچاتا ہوا بہتا چلا جاتا ہے۔ "لاوا" دراصل زمین میں موجود مختلف اشیاء کے پگھلے ہوئے مرکب کا نام ہے۔ اس کی مزید وضاحت یوں کی جاسکتی ہے کہ کروڑوں سال قبل جب زمین سورج سے علیحدہ ہوئی تھی تو لاوے کا ایک گولا تھی۔ لاوا دراصل مٹی کا پگھلا ہوا روپ ہوتا ہے۔ اس میں ہر طرح کی دھاتیں اور چٹانیں ملی ہوئی ہوتی ہیں۔ یہ پگھلے ہوئے کولتار کی طرح ہو جاتا ہے اور ٹھنڈا ہونے پر پھر مٹی اور چٹان بن جاتا ہے۔ لاوے سے بنی ہوئی زمین سورج سے علیحدہ ہوئی اور خلا میں گھومنے لگی اور بیرونی ٹھنڈک کی وجہ سے اس کے اوپر کی تہہ سخت ہو کر مٹی بنتی گئی مگر اندر لاوا موجود رہا۔ آج بھی زمین کے اندر بے حد و حساب لاوا موجود ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ زمین کی سطح ٹھنڈی ہونے کی وجہ

سے بہت موٹی ہو چکی ہے لاوا بننے، کھولنے اور پھوٹ کر بہہ نکلنے کا عمل آج بھی جاری ہے اور اس کے مختلف اسباب ہیں۔

ہم جس زمین پر رہتے ہیں یہ دراصل تہہ در تہہ پلیٹوں کی صورت میں ہے۔ یہ پلیٹیں ایک دوسرے کے اوپر رکھی ہوئی ہیں۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں میلوں پر پھیلی ہوئی یہ پلیٹیں اپنی جگہ سے کھسکتی ہیں تو ان کے کھسکنے یا ایک دوسرے سے رگڑنے کے باعث گرمی پیدا ہوتی ہے۔ یہ گرمی اتنی شدید ہوتی ہے کہ کمزور پلیٹیں پگھل کر لاوے کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ پھر ایک بڑی وجہ خود زمین کے اندر کا درجۂ حرارت بھی ہے۔ جو اس قدر شدید ہے کہ وہ سخت چٹانوں کو بھی پگھلا دیتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی گیسیں اور بعض معدنی اجزاء اس کو کھولتا رکھنے میں مدد دیتے ہیں جن میں کاربن ڈائی آکسائیڈ، ہائیڈروجن، سلفائیڈ اور گندھک وغیرہ شامل ہیں۔اس لاوے میں پتھریلی چٹانیں بلکہ لوہا تک مل کر پگھل جاتا ہے اور یوں گویا اتنی بہت ساری چیزوں کا کھولتا ہوا مرکب لاوا کہلاتا ہے جو کبھی کبھار شدید دباؤ کی وجہ سے زمین کی بیرونی سطح پر نکل آتا ہے۔ لاوے کے باہر نکلنے کی وجہ وہ دباؤ ہے جو اکثر و بیشتر اس پر پڑتا ہے۔ لاوے پر دباؤ کئی وجہ سے پڑتا ہے۔ اوّل تو لاوا خود ہی ابلتا رہتا ہے اور اس میں گیس بنتی رہتی ہے دوسرا جب زمین کے اوپر کا سمندری پانی یا بارش کا پانی رس رس کر لاوے تک پہنچتا ہے تو گرم لاوا اس کو بھاپ میں تبدیل کر دیتا ہے اور ظاہر ہے کہ بھاپ کو تو باہر نکلنے کے لئے راستہ چاہئے ہی۔ سو بھاپ یہ راستہ زمین کے نرم حصے میں تلاش کرتی ہے اور اسے پھاڑتی ہوئی باہر آجاتی ہے۔ بھاپ باہر آتی ہے تو بھاپ کے ساتھ کھولتا ہوا لاوا بھی باہر آجاتا ہے.....

آپ نے دیکھا ہو گا کہ عام انسانوں میں بھی اگر کسی پر ظلم اور زیادتی کا دباؤ ایک حد سے بڑھ جائے تو وہ بھی آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور پھر اس کا غصّہ کسی نہ کسی طور ظاہر ہونے لگتا ہے ..... توڑ پھوڑ ڈانٹ ڈپٹ یا مار پیٹ وغیرہ یہ سب انسان کے غصّے کا اظہار ہیں۔

یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہے کہ غصّہ اتارنے کے لئے انسان اس طرح کی حرکتیں کر ڈالتا ہے، اگر ایسا نہ ہو تو یہ غصّہ اندر ہی رہ جائے، انسان کے اعصاب کو تباہ کر دے اور انسان پاگل ہو جائے۔ بالکل اسی طرح آتش فشاں بھی زمین کے غصے کا اظہار ہیں اگر آتش فشاں نہ پھٹیں تو کیا معلوم یہ لاوا بھی اندر ہی اندر کھولتا رہے اور اس کا دباؤ اس قدر بڑھ جائے کہ زمین غبارے کی طرح کہیں سے بھی پھٹ جائے شہر کے شہر تباہ ہو جائیں اور زمین پر قیامت بپا ہو جائے۔

آج سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ جدید اور حساس آلات کی مدد سے آتش فشاں کے پھٹنے کا اندازہ پہلے سے لگا لیا جاتا ہے۔ ان پیشگی اندازوں کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آتش فشاں کے قرب و جوار میں رہنے والے لوگ کسی محفوظ مقام پر منتقل

ہو جاتے ہیں اور انسانی جانیں بڑی حد تک ضائع ہونے سے بچ جاتی ہیں۔

اُس دور میں جب آج کی طرح جدید آلات نہیں تھے، آتش فشاں کے باعث کیسی کیسی تباہ کاریاں ہوا کرتی تھیں اس کا اندازہ اس بات سے لگا لیجئے کہ ۱۴۷۰ قبل مسیح میں جب یونان میں سینتورینی آتش فشاں پھٹا تو اس نے پوری ایک تہذیب کو ختم کر کے رکھ دیا۔ یہ تہذیب Minoan Civilizations کے نام سے مشہور تھی اِس کے برعکس ان دنوں فلپائن میں پھٹنے والے آتش فشاں میں صرف ۵۰ کے لگ بھگ افراد ہلاک ہوئے ہیں۔ ان ہلاکتوں میں بھی بے احتیاطی کا دخل زیادہ ہے۔

یہاں ہم آپ کی دلچسپی اور معلومات کے لئے بتا دیں کہ اس وقت دنیا میں موجود آتش فشاں تقریباً پندرہ سو کی تعداد میں ہیں۔ جن میں سے زیادہ تر سمندر میں آج بھی لاوا اگل رہے ہیں۔

آتش فشاں پہاڑ دنیا میں ایک ترتیب سے پھیلے ہوئے ہیں عام طور پر ان کا سلسلہ سمندر کے نزدیک پایا جاتا ہے۔ جنوبی امریکہ میں ان پہاڑوں کا سلسلہ کوہ انڈیز سے شروع ہو کر وسطی امریکہ تک چلا گیا ہے۔ جزائر فلپائن، فارموسا، جاپان، انڈونیشیا اور نیوگنی تک یہ سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ جزائر فلپائن اور نیوزی لینڈ سے بحر منجمند شمالی تک اور اوقیانوس میں آئس لینڈ سے جزیرہ سینٹ ہلینا تک آتش فشاں پہاڑوں کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔

دنیا میں جتنے بھی آتش فشاں پھٹتے ہیں، ان میں سے ۶۲ فیصد بحرالکاہل کے قرب و جوار میں پھٹتے ہیں، انہی میں سے ۴۵ فیصد تو سمندر میں موجود جزیروں میں پھٹتے ہیں جبکہ ۱۷ فیصد شمالی اور جنوبی امریکہ میں موجود پہاڑوں کے مغربی حصّوں میں۔

دنیا کے دیگر خطوں میں پھٹنے والے آتش فشاں عموماً ۱۴ فیصد انڈونیشیا ۱۷ فیصد بحرالکاہل ایک فیصد بحراوقیانوس تین فیصد، وسطی بحرالکاہل، ۱۳ فیصد، بحراوقیانوس اور بقیہ ۷ فیصد بحر روم کے قرب وجوا میں پھٹتے ہیں۔

یہ پہاڑ جب آتش فشانی کرتے ہیں تو ان کا لاوا نہ صرف بستیوں کو تباہ اور انسانوں کو لقمۂ اجل بنا دیتا ہے بلکہ اس کی آواز سینکڑوں میل تک سنی جاتی ہے اور بہنے والے مادے کو زمین پر بیٹھنے اور جمنے میں کم از کم ایک سال کا عرصہ مزید لگ جاتا ہے

۱۸۸۳ء میں جاوا کے مشرق میں "کراکاٹوا" نامی آتش فشاں جزیرے کے پھٹنے سے اتنا شور ہوا کہ شاید ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کے گرنے سے بھی اس قدر شور نہ ہو۔ کراکاٹوا کے پھٹنے کی آواز دو ہزار میل دور آسٹریلیا تک گئی۔ دھماکے کی آواز نے سات مرتبہ پورے کرۂ ارض کا چکر لگایا تب کہیں جا کر ختم ہوئی۔ اس حادثے میں ۳۶ ہزار انسانی جانیں تلف ہوئیں۔

آتش فشاں کے پھٹنے سے اب تک ہونے والے نقصانات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگانا تو مشکل ہے

آتش فشاں کا سائنسی تجزیہ کرنیوالے آلات

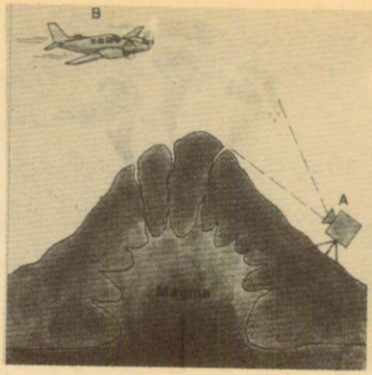

البتہ کہا جاتا ہے کہ ۱۹۱۴ء سے لے کر ۱۵۰۰ء تک آتش فشاں کے باعث تقریباً ایک لاکھ نوّے ہزار انسانی جانیں تلف ہو چکی ہیں۔ آتش فشاں کے برے اثرات بھی انسانی جانوں کے لئے خطرناک ثابت ہوسکتے ہیں۔ ۱۷۸۳ء میں Laki کا مشہور آتش فشاں پھٹا تو تقریباً دس ہزار افراد فقط اس کے برے اثرات سے بیمار ہو کر مرگئے۔ جاپان کے ایسے ہی ایک آتش فشاں Unzen Dake کے پھٹنے سے دس ہزار چار سو باون جانیں تلف ہوگئی تھیں۔ آتش فشاں پہاڑ بھی بظاہر دوسرے پہاڑوں کی طرح ہی ہوتے ہیں مگر ان میں ایک سرنگ ہوتی ہے۔ جو زمین کی گہرائی میں عموماً سینکڑوں میل دور اس مقام تک چلی جاتی ہے جہاں لاوا ابل رہا ہوتا ہے۔

۱۔ زندہ پہاڑ:۔ یہ پہاڑوں کی وہ قسم ہے جن میں سے اکثر لاوا بہہ کر نکلتا رہتا ہے۔ دنیا میں اس قسم کے تقریباً تین سو پہاڑ موجود ہیں جن میں سسلی کا "ایٹنا" اور اٹلی کا "ویسوریس۔" زیادہ مشہور ہیں۔ دنیا کے زندہ آتش فشاں پہاڑوں میں سب سے اونچا "کوٹوپیکسی" ہے جس کی بلندی ۱۹۶۱۲ فٹ ہے۔

۲۔ خفتہ پہاڑ:۔ یہ عموماً ایسے پہاڑ ہوتے ہیں جن سے طویل مدّت تک لاوا نہیں نکلتا اور لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اب یہ پہاڑ مردہ ہوچکا ہے۔ اسی غلط فہمی میں پہاڑ کے اطراف انسان بستیاں بنا کر رہنے لگتا ہے۔ کاشتکاری کرنے لگتا ہے اور پھر اچانک یوں ہوتا ہے کہ پہاڑ کا دہانہ پھٹتا ہے اور لاوا بہہ نکلتا ہے جس سے بستیاں اجڑ جاتی ہیں۔ اٹلی کا مشہور شہر "پامپی آئی" اسی طرح کے آتش فشاں سے تباہ ہوا تھا۔

۳۔ معدوم یا مردہ آتش فشاں پہاڑ:۔ یہ وہ پہاڑ ہیں جن سے کبھی لاوا نکلا کرتا تھا، اب نہیں نکلتا اور نہ مزید نکلنے کی توقع ہے ایسے پہاڑوں کے دہانوں میں پانی بھر جاتا ہے اور یہ جھیل کی شکل اختیار کرلیتی ہیں۔ کوہ سلطان ایسے ہی پہاڑوں میں سے ایک ہے۔ جاپان کا مشہور "فوجی پہاڑ بھی ایسا

ہی مردار آتش فشاں پہاڑ ہے جو آج دنیا بھر کے سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہے۔ فوجی پہاڑ گزشتہ دو سو ساٹھ سال سے خاموش ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دہانے سے بہنے والا لاوا پہاڑ کی شکل اختیار نہیں کرتا بلکہ زمین کی درزوں میں سے نکل کر زمین پر پھیل جاتا ہے اور زمیں وہاں ایک نئی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ بھارت کے مشہور علاقے دکن کی زمین بھی ایسے ہی لاوے سے بنی تھی۔

آتش فشاں رقبے عموماً ان علاقوں میں پائے جاتے ہیں جو سمندر کے قریب ہیں اور جہاں زمین اوپر کو ابھری ہوئی ہے۔ ویسے بحیثیت مجموعی زمین کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے جہاں ماضی میں کبھی نہ کبھی آتش فشاں کا عمل نہ ہوا ہو۔ آج ہم جزائر برطانیہ کو دیکھتے ہیں تو ایسا محسوس کرتے ہیں کہ شاید یہاں کبھی آتش فشاں کا عمل نہ ہوا ہو گا حالانکہ یہاں طویل مدت تک شدید اور مسلسل آتش فشاں قیامت ڈھاتی رہی اور اس قطع زمین کو زیر و زبر کرتی رہی۔

دنیا بھر میں بھڑکتے اور زندہ آتش فشانوں کا اجتماع "جزائر انڈونیشیا" ہے۔ یہاں پر انسانی تاریخ کے آغاز سے لے کر اب تک تقریباً ۱۸۰ آتش فشاں پھٹ چکے ہیں۔ ان میں سب سے مشہور مرکزی جاوا کا آتش فشاں "میرابی" جسے وہاں کے لوگ "آتشیں پہاڑ" کہتے ہیں۔

لاوا چٹان کی شکل اختیار کر رہا ہے۔

آتش فشاں یوں تو بہت نقصان پہنچاتے ہیں مگر ان کے بے شمار فوائد بھی ہیں، ایک بہت بڑے فائدے کا ذکر تو ہم کر ہی چکے ہیں کہ اگر دنیا میں آتش فشاں نہ ہوں تو زمین غبارے کی طرح ایک دھماکے سے پھٹ جائے۔

آتش فشاں سے نکلنے والا لاوا زمین کو نئی زرخیزی اور قوت عطا کرتا ہے جو انسانوں کے لئے بے حد فائدہ مند ہے۔ "چھاواں" نامی پتھر بھی اس لاوے سے وجود میں آتا ہے۔

یہ قدرت کا عجیب نظام ہے کہ جو آتش فشاں زمین پر قہر و غضب ڈھاتے ہیں، وہی زمین اور زمین پے بسنے والوں کو ان گنت فوائد بھی پہنچاتے ہیں، زمینی تغیرات اور تبدیلیوں میں آتش فشاں کا بڑا حصہ ہے۔ دنیا میں اکثر زلزلے بھی اس آتش فشاں کی وجہ سے آتے ہیں..... آتش فشاں کے علاقوں میں انسان نے زمین کی اندرونی حرارت کو جس سے زلزلے آتے ہیں مختلف نوعیت کی مشینیں چلانے کے لئے بھی استعمال کیا ہے۔ اس قسم کے تجربات کیلی فورنیا (امریکہ) جاوا (انڈونیشیا) اور ٹسنکی (اٹلی) میں کئے گئے ہیں اور ان پر تحقیق جاری ہے۔

قیمتی سرمایہ

میرزا ادیب

وہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ جہاں بارش سے ہر طرف پانی ہی پانی جمع ہو گیا تھا۔ دن کے بارہ بجے ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی تھی مگر جب تیسرا پہر شروع ہوا تو مینہ نے موسلا دھار بارش کی صورت اختیار کر لی تھی۔

شام ہوتے ہوتے آندھی بھی چلنے لگی تھی۔ مصیبت یہ ہوئی کہ تیز و تند جھونکوں کی وجہ سے بجلی کے تار ٹوٹ گئے اور گاؤں کے پکّے مکانوں کے اندر جو بلب جل رہے تھے وہ بجھ گئے۔ البتہ کچے گھروں کی لالٹینیں جلتی رہیں۔ مستری اللہ رکھا کے گھر میں بھی لالٹین جل رہی تھی اور اس لالٹین کی روشنی میں مستری اللہ رکھا کی بیوی مراد و بار بار اٹھ کر اپنی بیمار بیٹی صفیہ کی چارپائی کے پاس جا کر اسے دیکھتی تھی کہ

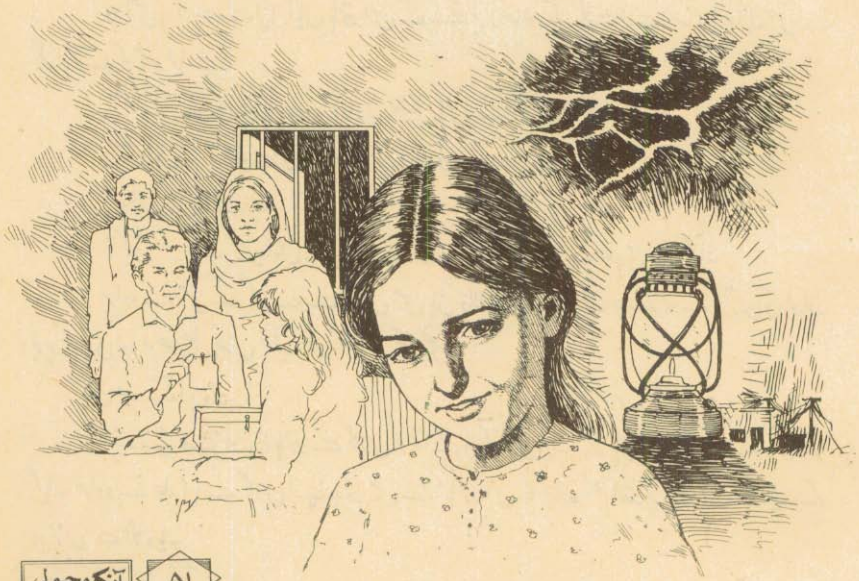

جاگ رہی یا سو رہی ہے۔

صفیہ دن کے وقت تو ہنستی بولتی رہتی تھی مگر کئی راتوں سے اس کا یہ حال ہو گیا تھا کہ **نیند اس کی** آنکھوں میں آتی ہی نہیں تھی۔ آتی بھی تھی تو آدھ گھنٹے یا اس سے کچھ زیادہ وقت گزرنے پر اڑ جاتی تھی اور اس رات تو اس کو بخار بھی ہو گیا تھا۔ مرادو بیٹی کے ماتھے پر ہاتھ رکھتی تھی تو یہ دیکھ کر بے قرار ہو جاتی تھی کہ بخار پہلے سے بڑھ گیا ہے۔ ماتھا پہلے سے زیادہ گرم محسوس ہوتا تھا۔

مستری اللہ رکھا گھر میں نہیں تھا۔ اسے شہر میں ایک مکان بنانے کا کام مل گیا تھا۔ دو دن سے وہیں تھا اور یہ کہہ کر گیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ دس روز تک واپس آجائے گا اور ابھی صرف چار دن ہوئے تھے۔

مستری عام طور پر شہر ہی جا کر کام کرتا تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں ماں بیٹی کو کسی قسم کی تکلیف نہیں رہتی تھی۔ سودا سلف مرادو خود بازار جا کر خرید لاتی تھی اور صفیہ ہر کام میں اس کی پوری پوری مدد کرتی تھی۔

بارش ہو رہی تھی۔ آندھی بھی چل رہی تھی۔ مرادو یہ سوچ کر اپنی چارپائی پر لیٹ گئی تھی کہ صفیہ سو رہی ہے۔ وقت ایک گھنٹے سے زیادہ گزر گیا تھا۔ مرادو کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو گیا کہ کہیں اس کی بیٹی جاگ نہ اٹھی ہو یا تیز بخار کی وجہ سے بے ہوش ہی نہ ہو گئی ہو۔

وہ اٹھی، آہستہ سے اپنا دایاں ہاتھ اس کے ماتھے پر رکھا اور یک لخت اسے احساس ہوا کہ اس نے گرم توے کو چھو لیا ہے۔

"صفو!" ماں کی گھبرائی ہوئی آواز بہ مشکل اس کے حلق سے نکلی۔

"جی اماں۔" صفیہ بڑی کمزور آواز میں بولی۔

"بخار..... بڑا تیز ہے۔"

"کوئی..... بات نہیں اماں! بس..... ذرا..... پانی۔" صفیہ نے جلدی سے کہا۔

مرادو نے مٹی کے گھڑے سے گلاس میں پانی ڈالا۔ بیٹی کی طرف جاتے ہوئے لالٹین کی لو اور اوپر کر دی اور ادھر چلی جہاں صفیہ اٹھ کر بیٹھ چکی تھی۔

"ماں صدقے! پی لو۔"

صفیہ نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے گلاس کو تھامنے کی کوشش کی۔ کچھ پانی اس کے کرتے کو گیلا کر گیا۔ مرادو نے جلدی سے گلاس اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس کا کنارہ بسم اللہ پڑھتے ہوئے صفیہ کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

لیک ہی گھونٹ پی کر صفیہ نے منہ پیچھے ہٹا دیا۔

"اور پیو۔"

"نہیں..... اماں!" یہ کہتے ہوئے صفیہ نے اپنا سر تکیے سے لگا دیا۔ وہ اس قدر کمزور ہو چکی تھی کہ چند لمحوں سے زیادہ بیٹھنا مشکل ہو گیا تھا۔

لالٹین کی مدھم روشنی میں مرادو اپنی بیٹی کو پریشان نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"صفو!"

"جی اماں۔"

"بخار بہت تیز ہے۔ میں حکیم صاحب....."

"نہ اماں!..... ٹھیک ہو جاؤں گی۔" صفیہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"وہ سامنے ہی تو جانا ہے۔ حکیم بڑا مہربان ہے۔ جلدی آجاؤں گی۔"

صفیہ منع کرتی رہی مگر مرادو نے الماری میں سے دوپٹہ نکال کر اوڑھ لیا۔

"اماں....."

مرادو کو معلوم تھا کہ صفیہ کیا کہنا چاہتی ہے۔ بولی

"میں ابھی گئی..... ابھی آئی۔" اصل میں مرادو دل میں ڈرتی تھی کہ بخار اور تیز نہ ہو جائے اس لئے وہ ہر حال میں حکیم صاحب سے دوا لانے کے لئے مصر تھی۔

"اللہ رحم کرے گا۔ گھبرانا بالکل نہیں..... ہیں صفو!"

"پر اماں باہر بڑا اندھیرا ہے۔"

"کوئی بات نہیں..... ایک منٹ ہی کا تو راستہ ہے۔"

مرادو دروازے کی طرف جانے لگی۔

"اماں لالٹین لے جاؤ۔" صفیہ نے کہا مگر یہ فقرہ اس کی ماں کے کان تک نہیں پہنچ سکا۔ وہ جلدی سے نکل گئی۔

ماں کے جانے کے بعد صفیہ کھلی آنکھوں سے چھت کو گھورنے لگی۔ ابھی اسے دو تین لمحے ہی گھورتے ہوئے گزرے ہوں گے کہ ایسا محسوس ہوا جیسے دروازے کے باہر سے آواز آئی ہے۔

اس نے چھت سے نظریں ہٹا کر دروازے کی طرف دیکھا۔

آواز پھر آئی جو صفیہ سمجھ نہ سکی۔ مگر وہ دروازے کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی تھی۔

"ماں گھر میں نہیں..... میں اکیلی....." اس کے ذہن میں اس خیال نے گھبراہٹ اور خوف

پیدا کر دیا۔

اب کے آواز آئی۔

"مہربانی کریں....."

"مہربانی کریں!..... یہ کیا معاملہ ہے..... کون ہے یہ..... کیا چاہتا ہے؟"

یہ سوچتے ہوئے وہ اٹھ کر چارپائی سے نیچے پاؤں رکھنے لگی۔

کوئی چور ہوتا تو دروازہ کھلا ہے۔ بڑی آسانی سے اندر آسکتا تھا۔ دروازے پر کھڑے ہو کر "مہربانی کریں" کیوں کہتا۔

نہ جانے اس میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر لالٹین اٹھائی اور دروازے کی طرف جانے لگی۔

"کون؟"

"میری بیٹی کی حالت بڑی خراب ہوگئی ہے۔ ڈاکٹر کے پاس جارہا تھا..... گر پڑا۔ لالٹین ٹوٹ گئی۔ اندھیرے میں ڈاکٹر کے گھر جانا مشکل ہے۔"

صفیہ دروازے کے پاس کھڑی یہ آواز سن رہی تھی۔

"مہربانی کریں....."

صفیہ نے منہ سے ایک لفظ تک نہ کہا۔ لالٹین ہاتھ بڑھا کر آگے کر دی۔

"بڑی جلدی واپس کر دوں گا۔"

اب کے صفیہ بولی۔

"لے جایئے۔"

لالٹین نہ رہی تو کمرے میں اندھیرا پھیل گیا۔ وہ اپنی چارپائی کی طرف جانے لگی۔ چارپائی تک پہنچنے میں اسے کوئی دقت نہ ہوئی۔ تکیے سے پشت لگا کر اس نے اپنا ہاتھ پیشانی پر پھیرا۔ اس کی انگلیاں پسینے میں بھیگ گئیں۔

چند منٹ تک وہ بیٹھی رہی۔

مراد واپس آگئی تھی۔ اس نے گھر میں اندھیرا دیکھا تو اس کا دل دہل گیا۔

"یا اللہ خیر۔" اس کے منہ سے نکلا۔

آہٹ ہوئی تو صفیہ نے اندازہ لگا لیا کہ اس کی ماں آگئی ہے اور اندھیرا دیکھ کر پریشان ہوگئی ہے۔

"اماں!"

"صفو!"

دونوں نے بیک وقت ایک دوسرے کو پکارا۔

"صفو....." مرادو کے دل میں کئی ایسے خیالات آگئے تھے جنھوں نے اسے بری طرف خوف زدہ کر دیا تھا۔

"اماں!" صفیہ بولی۔ "میں ٹھیک ہوں..... بالکل ٹھیک ہوں۔"

"تو..... لالٹین..... کیوں بجھ گئی ہے؟"

"اماں! لالٹین وہ شخص لے گیا ہے جسے ہم سے زیادہ ضرورت تھی۔"

"کیا کہہ رہی ہے تو؟" مرادو کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

"اماں..... کوئی فکر نہ کریں..... مل جائے گی" صفیہ کے لہجے میں ایک ایسے اطمینان کی جھلک نمایاں تھی جو ظاہر کر رہا تھا کہ وہ بالکل خیریت سے ہے۔ مرادو آگے بڑھ کر بیٹی کی چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"کون لے گیا لالٹین..... کون آیا تھا..... ہائے میرے اللہ۔ خیر ہوئی نا؟"

صفیہ کہنے لگی۔

"اماں! تو تو خواہ مخواہ گھبرا رہی ہے۔" اور اس نے سارا واقعہ سنا دیا۔

"میں تو بری طرح ڈر گئی تھی۔ حکیم صاحب کا انتظار کیا، کسی دعوت پر گئے تھے واپس نہیں آئے۔"

"اماں! اب پڑیوں کی کیا ضرورت ہے؟"

"کیوں؟"

"دیکھو تو..... بخار اتر گیا ہے میرا۔"

مرادو نے اس کا ماتھا چھوا۔ کچھ گرم تھا مگر پہلے جیسا نہیں تھا۔

"اللہ تیرا شکر ہے۔"

ماں بیٹی باتیں کرنے لگیں۔

باہر بارش ختم ہو چکی تھی۔ آندھی کا بھی زور نہیں رہا تھا۔ ابھی صبحِ کاذب تھی۔ پھر آہستہ آہستہ روشنی پھیلنے لگی کچھ دیر بعد دروازے میں سے روشنی اندر آتی ہوئی دکھائی دی۔

"کون؟" مرادو دروازے کے پاس پہنچی۔ وہاں دو شخص کھڑے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں

لالٹین تھی۔

"بہت بہت شکریہ۔ آپ نے میری بڑی مدد کی تھی۔ لیجئے اپنی امانت۔"

"میں بھی آپ کا بہت بہت شکریہ ادا کرتا ہوں۔ لالٹین نہ ملتی تو یہ صاحب میرے گھر پہنچ نہیں سکتے تھے۔"

"بہن جی! یہ ڈاکٹر ہیں۔ انہی کو ساتھ لے جانے کے لئے ان کے گھر گیا تھا۔ میری بچی کی حالت بڑی خراب ہو گئی تھی۔ انہوں نے ٹیکہ لگایا...... اور اللہ نے فضل کر دیا۔ یہ بھی آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لئے آئے ہیں۔" لالٹین والے نے کہا

دونوں یہ سمجھ رہے تھے کہ رات لالٹین مرادو نے دی تھی۔

"آپ اندر آ جائیں۔"

مرادو انہیں اندر لے آئی۔ جب وہ بیٹھ گئے تو مرادو نے ساری حقیقت بتائی۔

دونوں بہت متاثر ہوئے۔ ڈاکٹر نے بڑی محبت اور شفقت سے صفیہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"بیٹی! تیری یہ قربانی میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ ایسی ہی ایثار کرنے والی بچیاں قوم کا قیمتی سرمایہ ہوتی ہیں۔"

صبح طلوع ہو چکی تھی اور اس کی روشنی ہر طرف پھیلنے لگی تھی۔

اِسے پلّو سے باندھ لیجئے

اپنی تحریر بھجواتے ہوئے یا ہمیں خط لکھتے ہوئے اپنا پتہ لفافے کی پشت پر لکھنے کو کافی نہ سمجھئے۔ اپنے ہر خط اور اپنی ہر تحریر کے پیچھے اپنا نام اور مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

ادارہ آنکھ مچولی

آنکھ مچولی کا آئندہ خاص نمبر کیا ہو

آنکھ مچولی کے آئندہ خاص نمبر کے لیے موضوع بھی تجویز کیجئے — اور تحفہ بھی —

دلچسپ، مزے دار اور انوکھا موضوع اور تحفہ تجویز کرنے پر ہم آپ کو خوب صورت انعام بھی دیں گے اور آپ کا نام بھی شائع کریں گے۔ خیال رہے۔ تحفے کا معیار آنکھ مچولی کی قیمت میں اضافے کا باعث نہ بنے۔

ادارہ آنکھ مچولی

سوچیئے تو!!
خدانخواستہ جان پر بن آئے
اور خون کے بنا کوئی چارہ نہ ہو
آج آپ
کسی کو خون کا عطیہ دیجئے
کل کوئی
آپ کے کام آئے گا۔
منجانب
جملہ اقسام کی چھپی ہوئی تھیلیاں اور شاپنگ بیگ تیار کرنے والا معروف ادارہ
جیلانی انڈسٹریل کارپوریشن (پرائیویٹ) لمیٹڈ
F.312 ۔ سائیٹ کراچی۔ فون نمبر ۲۹۵۶۷۹،۸۹ - ۲۹۷۱۶۱ ۔ فیکس ۴۱۳۴۴۸

سمندر

صنوبر کے جنگلات

فطرت کی دنیا

شین فاروقی

وہ خطے جہاں زندگی پائی جاتی ہے

ہماری زمین زندگی سے بھری پڑی ہے۔ آپ جس طرف بھی نظر ڈالیں گے آپ کو پیڑ پودے، کیڑے مکوڑے اور حیوانات نظر آئیں گے۔ البتہ یہ الگ بات ہے کہ بہت سے حیوانات اور کیڑے مکوڑے ایسے ہیں جنہیں آپ کو تلاش کرنا پڑے گا۔ مثال کے طور پر اگر آپ سمندر کے ساحل پر نگاہ ڈالیں گے تو آپ کو وہاں کسی حیوان یا کیڑے مکوڑے کا کوئی سراغ نہیں ملے گا مگر جب آپ ساحل کو کھودیں گے تو ریت کے نیچے سے بے شمار اقسام کے کیڑے مکوڑے برآمد ہوں گے۔

دنیا میں ایسے بہت سے مقامات ہیں جہاں زندگی پائی جاتی ہے مگر وہاں تک انسان کی رسائی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر سمندر کی گہرائیوں میں، یہاں تک کہ فضا میں بھی زندگی پائی جاتی ہے۔ البتہ دنیا میں ایسے مقامات بھی موجود ہیں جہاں زندگی قائم نہیں رہ سکتی۔ ان مقامات میں قطب جنوبی، قطب شمالی اور بلند پہاڑوں کی چوٹیاں شامل ہیں۔ ان جگہوں پر زندگی ناپید ہے کیونکہ یہاں شدید سردی پڑتی ہے۔

دنیا میں دس لاکھ سے زیادہ اقسام کے حیوانات اور پیڑپودے پائے جاتے ہیں۔ البتہ کسی خاص مقام پر ان لاکھوں حیوانات اور پیڑپودوں میں سے زندگی کی کچھ ہی اقسام پائی جاتی ہیں۔ ہر جگہ پر حیوانات اور پیڑ پودوں کی خاص اقسام پائی جاتی ہیں۔ اور یہ خاص اقسام وہ ہوتی ہیں جو کسی دوسرے مقام پر نہیں پائی جاتیں۔ مثال کے طور پر برفانی ریچھ آپ کو صحرا میں نظر نہیں آئے گا اسی طرح پینگوئین جنگلات میں نہیں ملے گی۔ ہر پودے یا حیوان کے رہنے کی فطری جگہ دراصل اس

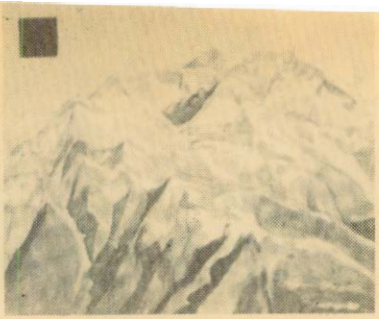

پہاڑی علاقہ

بارانی جنگلات

کا گھر ہوتی ہے اور دنیا میں ایسے بے شمار گھر پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر قطبین یعنی قطب شمالی اور قطب جنوبی یہ وہ مقامات ہیں جہاں سخت سردی پڑتی ہے۔ جنگلاتی علاقے جہاں گرمی ہوتی ہے اور بارش ہوتی ہے تاکہ پیڑ پودے اُگ سکیں۔ گھاس والے میدانی علاقے جہاں گرمی ہوتی ہے مگر یہاں پر خشک موسم پایا جاتا ہے۔ صحرا جو پانی سے محروم ہوتے ہیں۔ اسی طرح جھیلیں ہیں، ندیاں ہیں، ساحلی علاقے ہیں، سمندر ہیں، پہاڑ ہیں۔

ان تمام مقامات میں سے ہر مقام پر خاص قسم کے پیڑ پودے اور حیوانات پائے جاتے ہیں۔ دوسری اقسام کے پیڑ پودے اور حیوانات ان جگہوں پر نہیں رہ سکتے کیونکہ وہ ماحول کے اختلاف کے باعث ہلاک ہو جائیں گے۔

ہر زندہ شے کی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں۔ یہ خصوصیات اسے ایک خاص قسم کے ماحول میں رہنے کے قابل بناتی ہیں۔ اس شے کی یہی خصوصیات کسی دوسرے ماحول میں اس کے لئے جان لیوا ثابت ہوں گی۔ مثال کے طور پر مچھلیاں پانی کے اندر گلپھڑوں کے ذریعہ سانس لیتی ہیں۔ اگر ہم انہیں پانی سے باہر نکال لیں تو وہ مر جائیں گی کیونکہ ان کے گلپھڑے ہوا میں کام نہیں کر سکتے۔

ہر خاص ماحول میں پیڑ پودے اور حیوانات زندہ رہنے کے لئے ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں مثلاً حیوانات پیڑ پودوں کو پھلنے پھولنے میں مدد دیتے ہیں۔ یہی پیڑ پودے بڑے ہو کر حیوانات کو غذا اور رہائش فراہم کرتے ہیں بہت سے پودے اپنے جیسے دوسرے پودوں کے سہارے پر زندہ رہتے ہیں۔ اسی طرح بہت سے حیوانات بھی اپنے جیسے حیوانات کو غذا کے طور پر استعمال کر کے زندہ رہتے ہیں۔

اگرچہ دنیا کے مختلف ممالک میں یکساں ماحول پایا جاتا ہے تاہم ان ممالک میں مختلف حیوانات پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر امریکہ افریقہ اور آسٹریلیا میں یکساں ماحول پایا جاتا ہے لیکن ان ممالک میں پائے جانے والے پیڑ پودے اور حیوانات ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ان ممالک کے درمیان سمندر یا دوسری فطری رکاوٹیں پائی جاتی ہیں۔

لال لومڑی جس کے کان درمیانے سائز کے ہوتے ہیں۔

گھاس کے میدان۔

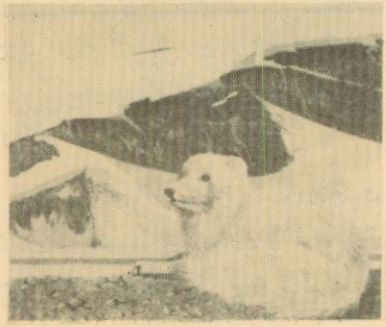

قطب شمالی کی لومڑی جس کے کان چھوٹے ہوتے ہیں۔

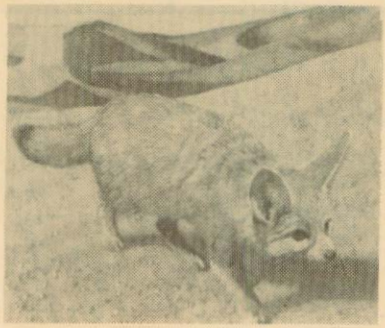

صحرائی لومڑی جس کے کان بڑے ہوتے ہیں۔

زمین پر چلنے والے حیوانات ان رکاوٹوں کو عبور نہیں کر سکتے اس لئے ان ممالک میں مختلف اقسام کے حیوانات پائے جاتے ہیں۔ تاہم ان مقامات پر جو حیونات پائے جاتے ہیں وہ مختلف ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے مماثلت رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ ان کے ماحول کی یکسانیت ہے۔

مثال کے طور پر برفانی لومڑی کے کان چھوٹے ہوتے ہیں لال لومڑی کے کان درمیانے درجے کے ہوتے ہیں جب کہ صحرائی لومڑی کے کان کافی بڑے ہوتے ہیں۔ لومڑیوں کے کانوں کے چھوٹے بڑے ہونے کا سننے کی صلاحیت سے کوئی تعلق نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ برفانی علاقوں میں سردی ہوتی ہے۔ جب کہ لال لومڑی جن خطوں میں پائی جاتی ہے وہاں سرد اور گرم دونوں طرح کے موسم پائے جاتے ہیں جب کہ صحرا میں گرمی پڑتی ہے۔ برفانی علاقوں کی لومڑی کے چھوٹے کان اسے گرمی حاصل کرنے میں مدد دیتے ہیں جب کہ صحرائی لومڑی کے بڑے کان اسے خود کو سرد رکھنے میں مدد دیتے ہیں ان سب باتوں کو دیکھتے ہوئے یہی کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو وہ تمام سہولتیں فراہم کی ہیں جو اسے آسانی کے ساتھ زندگی بسر کرنے میں مدد دیں۔

آزادی

سید نظر زیدی

مظلوموں کی پکار

قسط ۵

تینوں دوست محمد بن قاسم، موذ اور سعید آپس میں باتیں کرتے ہوئے بصرہ شہر سے باہر پہنچے۔ یہاں وہ اپنے ایک اور دوست کا انتظار کرنے لگے جو ان کے واسطے سواری کے گھوڑے لینے گیا ہوا تھا۔ موذ اور سعید آئندہ عید کو ہونے والے سالانہ فوجی کرتبوں اور ان میں حصہ لینے کے اپنے ارادوں کے بارے میں ہلکے پھلکے انداز میں باتیں کرتے رہے۔ اس دوران میں ان کے گھوڑے پہنچ گئے اور وہ لوگ ان پر سوار ہو کر شہر سے ذرا دور دریا کنارے چلے گئے جہاں انہیں تیرنے. نیزہ بازی اور تلوار بازی کی مشق کرنی تھی۔ مشق کے بعد جب وہ واپس لوٹ رہے تھے تو ایک ڈاکو ان سے گھوڑے اور تلواریں چھیننے کی نیت سے وہاں آیا محمد بن قاسم سے مقابلے کے بعد شکست کھا کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ ڈاکو دراصل اسلامی فوج کے ایک بہادر جرنیل بدیل تھے جو ان نوجوانوں کا امتحان لینے آئے تھے۔

عید کے دن دمشق کے باہر ایک کھلے میدان میں فوجی کھیلوں کے مقابلے کا انتظام کیا گیا تھا اور دن بھر مختلف کھیلوں کے مقابلے ہوتے رہے تھے۔ شام کو بالآخر ایک نوجوان تلوار بازی اور نیزہ بازی کے مقابلوں میں سب کو شکست [illegible] کر

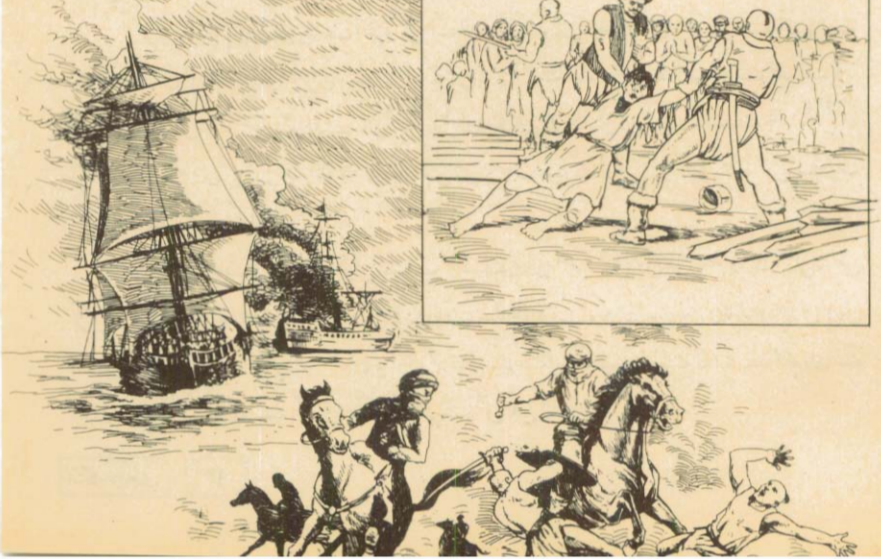

میدان میں اکیلا رہ گیا۔ وہ چیلنج دینے کے انداز میں اپنا گھوڑا ادھر ادھر دوڑا رہا تھا۔ اس کے لباس سے کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ وہ کس ملک کا باشندہ ہے۔ چہرے کو نقاب میں چھپا رکھا تھا۔ آخر میں امیر المومنین کے چھوٹے بھائی سلیمان بن عبدالملک اس نوجوان کے مقابلے میں آئے مگر شکست کھا گئے۔ اب وہ نوجوان ایک انوکھی شان سے میدان میں تنہا کھڑا تھا۔ کوئی اس کے مقابلے پر آنے کی جرأت نہیں کر رہا تھا۔ سارا میدان اس کے لئے نعرہ ہائے تحسین سے گونج رہا تھا۔ امیر المومنین نے جب انعام دینے کے لئے اس کو اپنے قریب بلایا تو پتہ چلا کہ وہ محمد بن قاسم ہے۔ سب لوگ خوش ہوئے اور خاص طور پر امیر المومنین۔ محمد بن قاسم کی ذہانت علمی اور فوجی قابلیت کے پیش نظر امیر المومنین نے اسے فارس کا والی مقرر کر دیا اور محمد بن قاسم اپنی والدہ سے مشورہ کرنے کی اجازت لے کر گھر چلا گیا۔

ان دنوں سندھ پر راجہ داہر کی حکومت تھی۔ یہ راجہ بہت ظالم اور بے ایمان شخص تھا۔ اس کی ایک برائی یہ تھی کہ اس نے اپنی سگی بہن سے شادی کر رکھی تھی۔ راجہ کے سارے درباری اس کے خوشامدی تھے ایک دن بھرے دربار میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ لنکا سے آنے والے مسلمانوں کے دو تجارتی جہازوں کو لوٹ لیا جائے۔ ان جہازوں میں صرف عورتیں اور بچے تھے۔ ان کو لوٹنے کا کام سمندری ڈاکوؤں کے ذمے لگایا گیا۔ لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے بلکہ ایک نوجوان مسلمان کی قیادت میں لڑتے ہوئے عورتوں اور بچوں نے ان ڈاکوؤں کو شکست دے کر گرفتار کر لیا۔

ابھی وہ لوگ زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ ایک بار پھر کئی بڑے بڑے جہاز ان کی طرف دکھائی دیئے۔ یہ راجہ داہر کی فوج تھی۔ زید ہر قسم کی صورت سے نپٹنے کے لئے تیار تھا مگر سندھی فوج نے صلح کا جھنڈا لہرا کر دھوکا دیا اور چالاکی سے مسلمانوں کے دونوں جہازوں پر قبضہ کر کے عورتوں اور بچوں سمیت سب کو قیدی بنا لیا۔ راجہ داہر کے قید میں ان لوگوں پر بہت مظالم ڈھائے گئے۔ زید کو ان لوگوں نے دیوی پر قربان کرنے کا انتظام کر رکھا تھا مگر عین موقع پر چند نقاب پوش قربان گاہ پہنچے اور زید کو آزاد کر لیا گیا۔ یہ ہندوستان کے مظلوم، نیچی ذات کے لوگ تھے جو راجہ کے ظلم سے تنگ آکر اب آزادی کا خواب دیکھ رہے تھے۔ زید نے انہیں یقین دلایا کہ اسلامی حکومت ضرور راجہ داہر کو سزا دے گی اور یہاں کے غریب اور ستم رسیدہ لوگوں کو اس کے ظلم سے نجات دلائے گی۔ نقاب پوشوں کے سردار نے زید کو بحفاظت ملکِ عرب تک پہنچانے کا وعدہ کر لیا۔

عراق کا حاکم حجاج بن یوسف اپنے محل کے ایک کمرے میں بیٹھا ہوا ان سفیروں سے باتیں کر رہا ہے جو ترکستان اور اُندلس کی خبریں لے کر آئے ہیں۔ حکومت کے دوسرے بڑے بڑے عہدے دار بھی پاس بیٹھے ہیں۔ ترکستان میں قتیبہ بن مسلم باہلی اور اندلس میں طارق بن زیادہ بہت سے علاقے فتح کر چکے ہیں اور سفیروں کی زبانی یہ حالات سن کر حجاج بن یوسف بے حد خوش نظر آرہا ہے۔ اس نے ایک سفیر کی طرف دیکھ کر کہا،

حجاج بن یوسف:۔ "میرا خیال ہے اب تمہارے یہاں ٹھہرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ کل صبح اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ اور ضروری باتوں کے علاوہ قتیبہ کو میرا یہ پیغام دینا کہ وہ پوری پوری ہمت سے جہاد کرے۔ یہاں ہر مسلمان یہ اچھی خبر سننے کے لئے بے تاب ہو رہا ہے کہ ہمارے مجاہدوں نے کمزوروں پر ظلم کرنے والے آخری حاکم کے سر سے بھی تاج اتار لیا.....!"

سفیر:۔ ”بہت بہتر۔ میں امیر کا یہ پیغام خاص طور پر پہنچاؤں گا۔“

حجاج:۔ ”اس کے علاوہ ایک اور بات.....!“

اتنا کہہ کر حجاج بن یوسف اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور گرجدار آواز میں بولا۔

حجاج بن یوسف:۔ ”اس کے علاوہ میری طرف سے قتیبہ کو خاص طور پر یہ تاکید کر دینا کہ کسی حالت میں بھی ان اچھی باتوں کو نہ بھولے جو اسلام نے ضروری قرار دی ہیں۔ اور جن کی تاکید حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اس وقت کی تھی جب اسامہ بن زیدؓ کے ساتھ مجاہدوں کی فوج شام کی طرف روانہ ہو رہی تھی۔ قتیبہ سے کہنا اس کا کوئی سپاہی عورتوں، بچوں اور بوڑھوں پر ہاتھ نہ اٹھائے۔ غیر مذہب والوں کی کوئی عبادت گاہ تباہ نہ کرے۔ ان کے باغ اور کھیت برباد نہ کئے جائیں۔“

سفیر:۔ ”جی بہت بہتر۔ میں یہ باتیں بھی سالار تک ضرور پہنچاؤں گا۔“

حجاج:۔ ”نہیں یوں نہیں۔ میں یہ سب کچھ تمہیں لکھ کر دیتا ہوں۔ تم زبانی صرف اس قدر کہہ دینا کہ اگر کسی نے یہ حکم نہ مانا تو میں اسے سخت سزا دوں گا اور یہ بات تم میں ہر شخص جانتا ہے کہ حکم نہ ماننے والوں کے لئے میرے دل میں ذرا رحم نہیں ہوتا۔“

یہ کہہ کر حجاج بن یوسف اس چوکی کی طرف بڑھا جہاں قلم دوات اور کاغذ رکھے تھے لیکن ابھی اس نے قلم اٹھایا ہی تھا کہ ایک عرب نوجوان بھاگتا ہوا اس کے کمرے میں داخل ہوا اور حجاج کی طرف دیکھ کر پوری طاقت سے چلایا۔

نوجوان:۔ ”یا امیر میں اسلام کی غیرت اور انصاف کے نام پر فریاد کرتا ہوں کہ مالدیپ کی عرب عورتوں اور بچوں کی مدد کیجئے۔“

اتنا کہہ کر یہ نوجوان بے حال ہو کر فرش پر گر پڑا۔ اس کے چہرے پر جمی ہوئی گرد، الجھے ہوئے بالوں اور پھٹے ہوئے کپڑوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کہیں رکے بغیر لمبا سفر کر کے آیا ہے۔ حجاج نے قلم ہاتھ سے رکھ کر اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھا۔ پھر ایک دم چونک پڑا جیسے کچھ یاد آ گیا ہو اور ایک فوجی سردار کی طرف دیکھ کر بولا۔

حجاج بن یوسف:۔ ”کیا یہ نوجوان زید بن ہاشم نہیں جو مالدیپ کے سوداگروں کی بیوہ عورتوں اور بچوں کو لانے کے لئے بھیجا گیا تھا؟“

”میں زید بن ہاشم ہی ہوں یا امیر!“ نوجوان نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

حجاج بن یوسف اور دوسرے سردار جلدی سے اس کی طرف بڑھے اور اسے سہارا دے کر قالین پر

لٹایا۔ حجاج کے اشارے سے دربار کے خاص حکیم نے زید کو طاقت دینے والی دوا کی ایک خوراک پلائی۔ اس کی پیشانی پر ٹھنڈے پانی کی گدیاں رکھیں اور اس طرح جب اسے ذرا ہوش آیا تو حجاج نے اس کے پاس بیٹھ کر سوال کیا۔

حجاج بن یوسف :۔ "زید! یہ تمہارا کیا حال ہے۔ وہ عرب عورتیں اور بچے کہاں ہیں جنہیں لینے کے لئے تم دیبل گئے تھے؟"

اس سوال کے جواب میں زید نے سمندری ڈاکوؤں کے حملے اور سندھ کے راجہ کی فوج کی دھوکہ بازی کا سارا حال سنایا اور جب وہ یہ بیان کر رہا تھا کہ اب یہ مظلوم عورتیں اور بچے راجہ داہر کی قید میں ہیں یہاں تک حالات سنانے کے بعد زید نے حجاج کو یہ بات خاص طور پر بتائی کہ جب سندھ کی فوج کے سپاہی عورتوں کو رسیوں سے باندھ رہے تھے۔ ایک عرب لڑکی نے اونچی آواز میں آپ کو مدد کے لئے پکارا تھا یہ بات سن کر حجاج بے قرار ہو گیا۔ اس نے بہت اونچی آواز میں کہا۔ بیٹی! میں آرہا ہوں۔" پھر وہ تن کر کھڑا ہو گیا اور ایک سردار کی طرف دیکھ کر بولا۔ "عبداللہ سلمی! تم جس حالت میں بیٹھے ہو اسی طرح اور اسی وقت سندھ کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ خدا کی قسم۔ جب تک ان ظالموں کو سزا نہیں مل جاتی مجھے چین نہیں آئے گا۔"

یہ کہہ کر حجاج بن یوسف جلدی سے مشرق کی طرف گھوم گیا اور اپنی تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھ کر پوری طاقت سے چلایا۔ "میری مظلوم بہنو! میری بیٹیو، میں تمہاری مدد کے لئے آرہا ہوں تم ذرا نہ گھبرانا!!"

عبداللہ سلمی اور دوسرے سردار فوراً اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے غصے کی وجہ سے ان سب کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ حجاج بن یوسف نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

حجاج بن یوسف :۔ "میں چاہتا ہوں آج کا سورج ڈوبنے سے پہلے بصرے سے اسلامی فوج روانہ ہو جائے۔ مکران پہنچ کر سندھ کے راجہ کو لکھا جائے کہ وہ ان شریروں کو پکڑ کر ہمارے حوالے کر دے جنہوں نے مظلوم عورتوں اور بچوں کو ستایا ہے۔ اور ان عورتوں اور بچوں کو فوراً یہاں بھیجنے کا انتظام کرے۔ اگر وہ یہ بات مان لے تو اس سے اچھی کوئی بات نہیں ورنہ سندھ کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا جائے۔ بس اب سب لوگ اپنے اپنے گھر جائیں اور اس سلسلے میں ضروری تیاریاں کریں۔"

○ ..... ○ ..... ○ ..... ○ ..... ○

امیر المومنین ولید بن عبدالملک کتنی ہی دیر سے ایک نقشے کو غور سے دیکھ رہے ہیں اور حکومت کے بڑے بڑے عہدے دار اور فوجی سردار اپنی کرسیوں پر خاموش بیٹھے ہیں۔ ان سب کے چہرے سے ایسا

ظاہر ہو رہا ہے کہ انہوں نے ابھی ابھی کوئی بہت ہی بُری خبر سنی ہے۔

امیر المومنین نے نقشے سے نظریں ہٹا کر کچھ دیر کے لئے آنکھیں بند کرلیں۔ جیسے سوچ سوچ کر تھک گئے ہوں اور پھر حجاج بن یوسف کی طرف دیکھ کر بولے۔ "عبداللہ سلمی کے بعد بدیل بن طہفہ جیسے بہادر سالار کا شہید ہو جانا ہمارے لئے ایک بہت بڑا صدمہ ہے، ایک بہت بری خبر ہے۔"

حجاج:۔ "امیر المومنین کی طرح ہم سب کو ان دونوں بہادر سرداروں کے شہید ہو جانے کے بے حد رنج ہے۔ اور اس لئے سب چاہتے ہیں کہ امیر المومنین ملک سندھ پر ایک بڑا حملہ کرنے کی اجازت دے دیں۔"

امیر المومنین:۔ "خود ہماری بھی یہی رائے ہے کہ اب اس ظالم راجہ کو اور مہلت نہیں دینی چاہئے۔ اس کی شرارتیں حد سے بڑھتی جارہی ہیں۔ لیکن سندھ پر بڑا حملہ کرنے سے پہلے ہمارے نزدیک اس بات کا پتہ چلانا ضروری ہے کہ آخر ہمارے ان دونوں سالاروں کو شکست کیوں ہوئی؟"

حجاج:۔ "اگر امیر المومنین اجازت دیں تو میں عرض کروں!"

امیر المومنین:۔ "ہم نے تو خود سوال کیا ہے۔"

حجاج:۔ "ان لڑائیوں کی ساری خبریں سننے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان دونوں سالاروں کی موت اور شکست کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوئی کہ وہ اس ملک سے اچھی طرح واقف نہ تھے اور انہوں نے سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کی جگہ اپنی تلوار پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کیا جبکہ جنگ میں عقل سے کام لینا ضروری ہوتا ہے۔ خاص طور پر بدیل بن طہفہ تو اس وجہ سے شہید ہوئے کہ اپنی حفاظت کا خیال کئے بغیر وہ اکیلے ہی دشمن کی فوج میں دور تک گھستے چلے گئے اور جب ان کا گھوڑا ایک ہاتھی سے ڈر کر بھاگا تو گر کر شہید ہو گئے۔"

سلیمان بن عبدالملک:۔ "اور اگر امیر المومنین مجھے بولنے کی اجازت دیں تو عرض کروں گا کہ اس نقصان کی اصل وجہ ان لوگوں کی ناسمجھی ہے جنہوں نے ایسے نازک وقت میں سندھ پر حملہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔"

حجاج:۔ (کسی قدر غصے سے) "آپ کیا فرما رہے ہیں شہزادہ صاحب!"

سلیمان:۔ "میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ایسے نازک وقت میں جبکہ ہماری فوجیں ایک طرف ترکستان میں اور دوسری طرف اندلس میں لڑ رہی ہیں ایک تیسرے ملک پر حملہ کر دینا کسی طرح بھی ٹھیک نہ تھا۔"

حجاج:۔ "اوّل تو یہ سندھ پر حملہ نہ تھا۔ ہم نے مظلوم مسلمان قیدی عورتوں کو آزاد کرانے کے لئے

اپنے سپاہی بھیجے تھے، لیکن اگر اسے حملہ بھی کہہ لیا جائے تو میں کہوں گا کہ ترکستان اور اندلس کے ساتھ لڑائی چھڑی ہونے کے باوجود سندھ جیسے ملک کو فتح کر لینا ہمارے لئے کچھ مشکل نہیں، خدا کے فضل و کرم سے ہمارے غازی ایسا دم خم رکھتے ہیں کہ اگر اس دنیا کے سارے ملکوں کے خلاف جنگ کا اعلان کر کے ہم ایک نئی دنیا پر بھی حملہ کر دیں تو فتح کا جھنڈا ہمارے ہاتھ میں رہے گا۔"

سلیمان:۔ "یہ صرف شاعری ہے، میں اپنے عزت والے بزرگ کو یاد دلاؤں گا کہ سپاہیوں اور لڑائی کے عمدہ سامان کے بغیر کوئی جنگ نہیں جیتی جاسکتی اور آج کل ہمارے پاس ان دونوں چیزوں کی کمی ہے۔ اس کے علاوہ مجھے تو کوئی ایسا سالار بھی نظر نہیں آتا جو قتیبہ بن مسلم اور طارق بن زیادہ جیسا سمجھدار اور بہادر ہو۔"

حجاج:۔ "شہزادہ سلیمان کی یہ باتیں سن کر مجھے بے حد حیرانی ہوئی۔ کیا ایک مسلمان نوجوان اتنی جلدی یہ بات بھول سکتا ہے کہ بدر، احد، خندق، قادسیہ اور یرموک کی لڑائیوں میں اس کے بزرگوں کی تعداد دشمنوں کے مقابلے میں آدھی بھی نہ تھی اور یہ تو ابھی کل کی بات ہے کہ طارق بن زیاد نے صرف سات ہزار مجاہدوں کے ساتھ اندلس کے لاکھوں سپاہیوں کو شکست دی ہے۔"

حجاج بن یوسف نے کچھ دیر رک کر جوش بھری آواز میں کہا۔ "خدا کی قسم سندھ جیسے ملک کو تو ایک مسلمان بچہ فتح کر سکتا ہے، اور اس کے لئے نہ کسی بڑی فوج کی ضرورت ہے نہ لڑائی کے بھاری سامان کی، ضرورت ہے تو صرف اس بات کی کہ اپنے بزرگوں کی طرح ان نوجوانوں کے سینے ایمان کے نور سے روشن ہوں اور اپنے کسی فائدے کے جگہ ان کے سامنے سچائی اور انصاف کے اصول ہوں۔"

حجاج بن یوسف کی اس تقریر کے بعد تھوڑی دیر کے لئے دربار پر خاموشی چھا گئی۔ شہزادہ سلیمان بن عبدالملک کچھ جواب دینے کی جگہ غصے میں بھر گیا۔

امیر المومنین کچھ دیر ٹھہر کر بولے۔ "حجاج! تم ٹھیک کہتے ہو۔ جس ملک کے حاکم لالچی، ظالم اور بے انصاف ہوں۔ جہاں بے جان پتھروں، درختوں اور دریاؤں کی پوجا ہوتی ہو اور جہاں کروڑوں انسانوں کو ناپاک سمجھ کر ان سے نفرت کی جاتی ہو اسے فتح کرنا کچھ مشکل نہیں۔ اور اگر مشکل بھی ہو تو اب ہم اس کام کو ادھورا نہیں چھوڑ سکتے۔ سندھ کے ظالم راجہ نے مسلمان عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر کے ایک ایسا بُرا کام کیا ہے کہ اسے اس کی سزا ملنی ہی چاہئے۔ ہم تمہیں اجازت دیتے ہیں کہ سالاروں میں سے کسی کے سپرد یہ کام کر کے لڑائی کی تیاری شروع کر دو۔"

سلیمان:۔ (غصے میں منہ بناتے ہوئے) "اس کے لئے تیاری کی کیا ضرورت ہے، چچا حجاج کو چاہئے کسی بچے کو پکڑ کر سندھ کی طرف بھیج دیں وہ مہینے دو مہینے کے اندر وہاں کے بڑے شہروں کی کنجیاں لا کر ان کے

قدموں میں رکھ دے گا۔"

حجاج:۔ "میں اپنے عزیز شہزادہ سلیمان کا طعنہ سن کر غصے میں نہیں آیا۔ بلکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ سندھ پر حملہ کرنے والی فوجوں کا سالار بنانے کے لئے میں نے ایک بچے ہی کو چنا ہے۔"

سلیمان:۔ "اس کا نام؟"

حجاج:۔ "محمد بن قاسم۔"

یہ نام سن کر شہزادہ سلیمان زور سے ہنس پڑا اور ہنستے ہنستے بولا۔ "محمد بن قاسم۔ جس کی عمر ابھی صرف سولہ سال اور کچھ مہینے ہے اور جس کے منہ سے ابھی ماں کے دودھ کی بُو آتی ہوگی۔"

سلیمان کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ امیر المومنین نے اسے بیچ میں روک کر کہا۔

امیر المومنین:۔ "تم خاموش رہو سلیمان! سندھ پر حملہ کرنے والی فوجوں کا سالار بنانے کے لئے محمد بن قاسم سے بہتر کوئی نہیں ہو سکتا، اس نوجوان کی بہادری اور عقلمندی کا حال تو تم بھی جانتے ہو۔ ابھی پچھلے دنوں نیزہ بازی کے مقابلے میں اس نے اوّل انعام حاصل کیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ آج کل فارس کا حاکم ہے جو سندھ کے قریب ہے۔"

حجاج:۔ "میرے ذہن میں اس کا خیال خاص طور پر اس لئے آیا ہے کہ ایک تو یہ نوجوان بہت سمجھدار اور بہادر ہے، دوسرے اسے سندھیوں سے لڑنے کا طریقہ معلوم ہے، ایرانیوں کی طرح سندھ کی فوج کا سب سے خطرناک ہتھیار ہاتھی ہے اور محمد بن قاسم ہاتھیوں کی جنگ کے بارے میں بہت کچھ سیکھ چکا ہوگا۔"

دوسرے عہدے داروں اور فوجی سرداروں نے بھی حجاج بن یوسف کی بات کو ٹھیک بتایا اور آخر میں یہی فیصلہ ہوا کہ سندھ کے راجہ کو سزا دینے کے لئے فوج ضرور بھیجی جائے اور اس فوج کا سردار محمد بن قاسم کو بنایا جائے۔

جاری ہے

پائدان

ڈائریکٹر (نئے امیدوار سے) "ہمارے ہاں صفائی پر بہت دھیان دیا جاتا ہے۔ کیا آپ نے آتے وقت پائدان پر جوتے صاف کئے تھے؟"

"جی ہاں!" امیدوار فوراً بولا۔

"ایک بات اور" ڈائریکٹر بولا "ہمارے ہاں سچ بولنے پر بھی خاص دھیان دیا جاتا ہے اور ہمارے دفتر میں کوئی پائدان نہیں ہے۔"

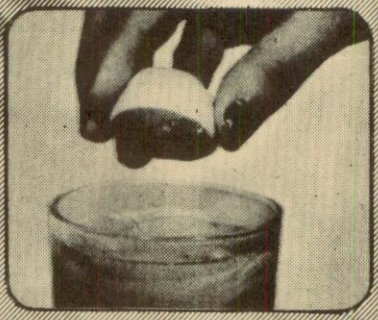

گرمی، حبس یا برسات
پیجیے نورس لیموں ساتھ
NUQRA
نورس
نورس کو موسم سے ہم آہنگ کرکے نوش جان کیجیے۔
نورس کے ایک گلاس میں چند قطرے لیموں ملائیے۔
نورس
منفرد ذائقہ
صحت بخش تاثیر
جو آپ کو موسم کے مضر اثرات سے بچائے۔
ہر لمحہ چاق و چوبند رکھے۔
جسم و جان کو توانائی بخشے۔
قدرت نے ذائقہ دیا

ORIENT

ریل کا سفر

سید مسعود حسن رضوی ادیب

اس مضمون میں شاید آپ کو کوئی خاص بات محسوس نہ ہو۔ لیکن اس میں ایک خاص بات ہے اور وہ یہ کہ یہ اس زمانے میں لکھا گیا ہے جب برصغیر میں ریل نئی نئی آئی تھی۔ ذرا دیکھئے تو سہی اس وقت اسے کیسا محسوس کیا گیا تھا۔

تھوڑے دن ہوئے الہ آباد ہائی کورٹ میں میرا ایک مقدمہ تھا، اس لئے مجھے لکھنؤ سے الہ آباد جانا پڑا۔ گاڑی ٹھیک دس بجے رات کو چھوٹتی تھی، مگر میرا قاعدہ ہے کہ میں ریل کے وقت سے آدھ گھنٹا پیشتر اسٹیشن پر پہنچ جاتا ہوں۔ اس مرتبہ بھی اپنی گھڑی کے حساب سے میں ٹھیک وقت پر پہنچا۔

میرے پاس اسباب زیادہ تھا۔ پہلے میں نے اپنا اسباب تولوایا اور بابو صاحب کو محصول دے کر رسید لے لی۔ قلی نے اسباب لے جاکر "بریک" میں رکھ دیا۔ میں نے جیب سے گھڑی نکال کر دیکھی۔ ساڑھے نو بجے تھے۔ میں اطمینان سے ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ ایک دفعہ اسٹیشن کی گھڑی پر جو نظر پڑتی ہے تو کیا دیکھتا ہوں کہ دس بجنے میں صرف دس منٹ باقی رہ گئے ہیں۔ جی دھک سے رہ گیا اور میں

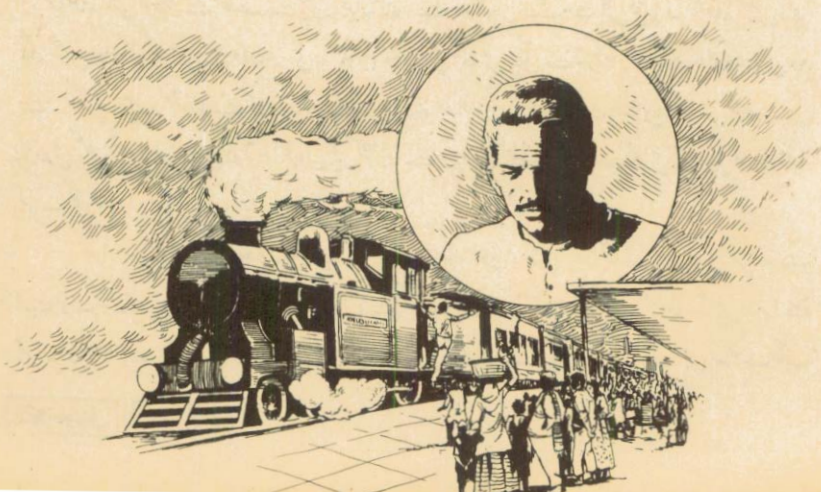

وہاں سے سیدھا ٹکٹ گھر پہنچا۔

میں بے کار پیسا کبھی نہیں اٹھاتا، ہمیشہ وہی بات کرتا ہوں کہ کام بھی ہو جائے اور دام بھی کم لگیں۔ اسی وجہ سے میں اکثر تھرڈ کلاس، یعنی تیسرے درجے میں سفر کرتا ہوں۔ تیسرے درجے کے ٹکٹ گھر پر جو پہنچا تو وہاں مسافروں کے ٹھٹھ لگے ہوئے تھے۔ الہ آباد میں کمبھ کا میلا ہونے والا تھا۔ ہزارہا مسافر میلا دیکھنے جا رہے تھے۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ گھسن پل کے ٹکٹ لے آؤں، مگر وہاں ہوا کا گزر تو مشکل تھا، میرا سا موٹا تازہ آدمی کیونکر سما جاتا؟

جب میں یہاں سے مایوس ہوا تو انٹر کلاس، یعنی ڈیوڑھے درجے کے ٹکٹ گھر کی لپکا۔ یہاں اتنی بھیڑ تو نہ تھی، پھر بھی آدمی پر آدمی ٹوٹا پڑتا تھا۔ غرض کہ ٹکٹ نہ ملنا تھا نہ ملا اور گاڑی نے سیٹی دے دی۔ اس دن نہ معلوم کتنے آدمی بے چارے ٹکٹ نہ ملنے کی وجہ سے رہ گئے، مگر اسباب ریل میں رکھ دیا جا چکا تھا اور مجھے دوسرے ہی دن الہ آباد پہنچنا بھی ضرور تھا۔ میں دوڑا کہ بے ٹکٹ ہی سوار ہو جاؤں۔ جو کچھ پڑے گی بھگت لوں گا۔

پلیٹ فارم پر جو پہنچا تو بہت سے لوگ ٹکٹ لئے ہوئے ادھر سے ادھر گھبرائے ہوئے پھر رہے تھے۔ ریل میں کہیں تل رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔ میں بھی کچھ دیر ادھر ادھر بھٹکتا پھرا۔ کہیں جگہ نہ ملی۔ فرسٹ اور سیکنڈ کلاس، یعنی پہلے اور دوسرے درجوں میں جگہ خالی تھی مگر جو ایک کی جگہ چار خرچ کرے وہ ان درجوں میں بیٹھنے کی ہمت کرے۔

اب گاڑی رینگ چلی۔ اس وقت بعض مسافروں کی گھبراہٹ، بعض کی حسرت بھری نگاہیں دیکھنے کے قابل تھیں۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ مجمع کو چیرتا پھاڑتا آگے بڑھا۔ ایک درجے کا دروازہ کھلا رہ گیا تھا۔ اس کو پکڑ کے جھٹ سے چڑھ گیا۔ اندر سے مسافروں نے بہت غل مچایا کہ "جگہ نہیں ہے، جگہ نہیں ہے"، مگر میں نے ایک نہ سنی۔ پاؤں ٹکانے کی جگہ مل جاتی ہے تو رفتہ رفتہ بیٹھنے کا ٹھکانا ہو ہی جاتا ہے۔ اگرچہ قاعدہ مقررہ ہے کہ ایک درجے میں اتنے مسافروں سے زیادہ نہ بیٹھیں، مگر اس قاعدے کی پابندی کبھی نہیں ہوتی۔ پہلے تو مسافروں کی کثرت سے میرا دم گھٹنے لگا، مگر جب گاڑی تیز ہوئی اور ہوا فر فر کرنے لگی تو ذرا دم میں دم آیا۔

سوار ہونے کو تو میں ہو گیا، مگر اب نئی فکر سر پر سوار ہوئی۔ میں جانتا تھا کہ ریلوے کی طرف سے ایسے لوگ نوکر ہیں جو چلتی گاڑی میں مسافروں کے ٹکٹ دیکھتے اور "ٹی۔ ٹی۔ سی" کہلاتے ہیں۔ راستے بھر یہ دھڑکا رہا۔ آخر صبح ہوتے ہی الہ آباد اسٹیشن کے قریب پہنچ کر ٹی۔ ٹی۔ سی صاحب ملک

الموت کی طرح نازل ہوگئے۔ میری تو جان سوکھ گئی۔ انہوں نے "ٹکٹ، ٹکٹ" آواز لگائی اور لوگ اپنے اپنے ٹکٹ دکھانے لگے۔ کسی نے اپنی جیب سے ٹکٹ نکالا، کسی دیہاتی نے پگڑی کے بیچ سے، کسی گنوار نے دھوتی کے ٹینٹ سے۔

ایک مسافر کے پاس اسباب بہت تھا۔ ٹی۔ ٹی۔ سی نے محصول کی رسید مانگی، مگر اس کے پاس ہوتی تو دیتا۔ ٹی۔ ٹی۔ سی نے کہا کہ تیسرے درجے کے مسافر اپنے بستر کے علاوہ صرف پندرہ سیر اسباب بلا محصول لے جاسکتے ہیں۔ اس سے جتنا زیادہ ہو اس کا محصول پڑتا ہے۔ اس کے پاس ایک کانٹا تھا۔ اس سے اس نے اسباب تولا اور مسافر سے محصول لے کر رسید لکھ دی۔

میں حیران تھا کہ مجھ سے ٹکٹ مانگے گا تو کیا کہوں گا۔ آخر ایک تدبیر سمجھ میں آگئی۔ میں نے ٹی۔ ٹی۔ سی کو اپنے پاس بلایا، اور چپکے چپکے اپنا سارا حال کہہ سنایا، اور اس سے کہا کہ اگر آپ سب کے سامنے مجھ سے ٹکٹ مانگیں گے تو ناحق میری ذلت ہوگی۔ آپ کا بڑا احسان ہوگا اگر آپ اگلے اسٹیشن پر ریل سے اتر کر مجھ سے ٹکٹ کے دام لے لیں۔

ریلوے کے ملازموں میں انسانیت بہت کم ہوتی ہے، مگر ٹی۔ ٹی۔ سی بے چارہ بھلا مانس تھا۔ کہنا مان گیا۔ جب اسٹیشن آیا میں نے ریل سے اتر کر اس کو ٹکٹ کے دام دیئے۔ اس نے کہا، "جب کوئی مسافر بے ٹکٹ کے سوار ہو جاتا ہے تو اس کو دوگنے دام دینا پڑتے ہیں۔" میں نے کہا، "بھائی، میں بے ٹکٹ سوار ہونے کو بہت بُرا سمجھتا ہوں۔ آج کچھ ایسی ہی مجبوری تھی کہ مجھے پہلے پہل یہ بُرا کام کرنا پڑا۔ خیر، مجھ کو قانون کی پابندی میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔" قصہ مختصر، میں نے ان کو دام دیئے، انہوں نے مجھ کو رسید دی۔

اب میں بے کھٹکے ہو کر بیٹھا۔ کچھ دیر بعد گاڑی الہ آباد کے اسٹیشن پر پہنچ گئی۔ میں ریل سے اتر کر چلا۔ اسٹیشن کے پھاٹک پر "ٹکٹ کلکٹر" نے ٹکٹ مانگا۔ میں نے وہی رسید دے دی جو ٹی۔ ٹی۔ سی نے مجھے دی تھی۔ اسٹیشن کے باہر بہت سے اِکّے اور گاڑیاں کھڑی تھیں۔ میں نے ایک اِکّہ کر لیا اور کوئی سات بجے شہر میں پہنچ گیا۔

دس بجے رات کو لکھنؤ سے سوار ہوا تھا اور سات بجے الہ آباد پہنچ گیا۔ اتنا لمبا سفر صرف نو گھنٹے میں طے ہو گیا۔ اگر ڈاک گاڑی سے جاتا تو چار ہی گھنٹے میں پہنچ جاتا۔ یہ ریل کی برکتیں ہیں، ورنہ اگر ریل نہ ہوتی تو لکھنؤ سے الہ آباد جانا پہاڑ ہو جاتا۔ نہ معلوم کتنے دن لگتے، کتنا وقت رُپیا صرف ہو جاتا اور کتنی تکلیفیں اٹھانا پڑتیں۔

بدی کا بدلہ

امان اللہ نیّر شوکت

ایک بچھو ایک کچھوے کا تھا دوست
اور وہ دونوں تھے جیسے مغز و پوست
اتفاقاً اک پڑا ان کو سفر
پہنچے اک دریا پہ دونوں آن کر
پیٹھ پر جلدی سے بچھّو کو بٹھا
تیرنے کچھوا لگا گردن بڑھا
کر چکا طے جب وہ آدھے پاٹ کو
ڈنک تب بچھّو نے مارے ایک دو
ڈنک کھا کر دی یہ کچھوے نے پکار
یہ بدی کا وقت ہے؟ اے میرے یار
جب سنی یہ بات بچھّو نے کہا
اپنی فطرت سے ہوں میں تنگ آگیا
پھر تو کچھوے نے بھی اک ڈبکی لگا
پیٹھ سے اپنی کیا اس کو جدا
اور کہا ہر چند تیرا یار ہوں
کیا کروں عادت سے میں لاچار ہوں
لے گیا کچھوا سلامت اپنی جاں
غوطے کھا کے مرگیا بچھّو وہاں
دیکھ نیّر ہے بدی کا یہ ثمر
نیک ہے نیکی کا پھل بھی! بے خبر

کورسان کی چٹانیں

سیّد غلام جیلانی

"دادا ابو کہانی" ایک طرف فہد دوسری جانب تحریم نے ایک آواز ہو کر فرمائش کی۔

"اچھا بھئی۔ سنائیں گے ذرا دم تو لینے دو۔" دادا ابو کا سیڑھیاں چڑھنے سے سانس پھول رہا تھا کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد کہانی شروع کی۔

"تو فدّے میاں۔ ایک زمانہ تھا....."

"فدّے نہیں۔ فہد دادا ابو۔" فہد میاں جھنجھلا کر بولے۔ "نہیں تو پھر کٹّی۔"

"سوری! سوری!!" دادا ابو نے سلسلہ پھر سے شروع کیا۔ "تو فہد میاں۔ ایک زمانہ تھا جب سارسوں کے بھی لمبی لمبی سی خوب صورت دُم ہوتی تھی۔ آج کل جیسی نہیں ٹنڈ۔ منڈ۔ سارس تو تم نے دیکھے ہیں نا۔ سفید لمبی لمبی ٹانگیں۔ لمبی گردن۔ لمبی چونچ۔ تالاب کے کنارے ایک ٹانگ پر کھڑے مچھلی

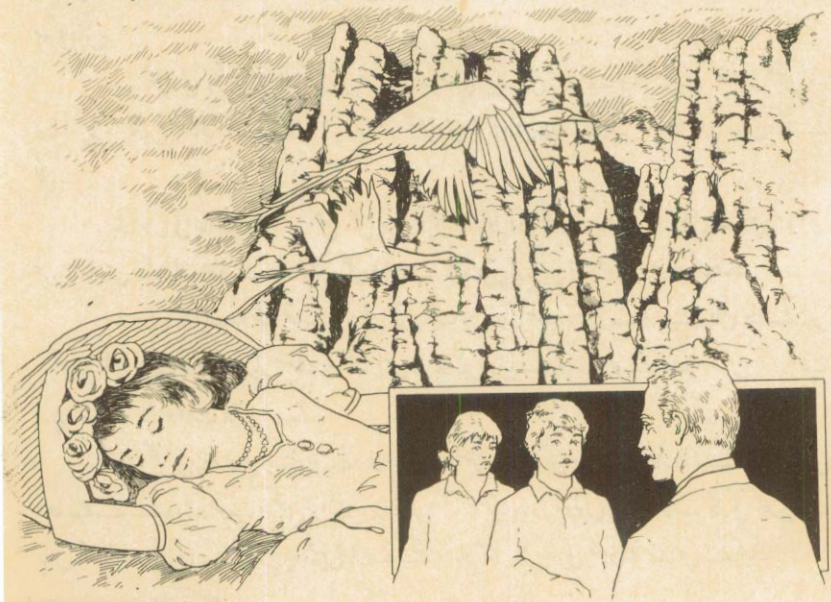

کی ناک میں۔ اپنے کراچی کے چڑیا گھر میں اور راولپنڈی کے ایوب پارک میں؟ مگر دُم دیکھی ہے۔ کیسی چھوٹی سی جیسے کسی نے نوچ لی ہو؟" پہلے یہ ایسی بھدی تھوڑا ہی تھی!"

"تو اب کیوں ایسی ہوگئی؟" تحریم بول پڑیں۔

"ہاں بھئی تحریم بی بی۔ یہی تو میں آج بتانے جارہا ہوں"۔ دادا ابو نے جواب دیا۔ "بس تم چپ چاپ کان لگا کر سنے جاؤ۔

تو ہوا یوں کہ بہت دنوں پہلے ہنزہ میں ایک بادشاہ تھا۔ ان کی ایک بیٹی تھی۔ اپنے ابو امی کی بڑی چہیتی....."

"جیسے میں؟ دادا ابو؟" تحریم نے پھر لقمہ دیا۔

"ہاں گڑیا۔ ٹھیک جیسے اپنی تحریم" دادا ابو نے جواب دیا۔ "مگر شہزادی بڑی تھی۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر شکار کھیلنے جایا کرتی۔

ایک دن وہ ایک شکار کا پیچھا کر رہی تھی۔ کہ گھوڑا سرپٹ بھاگتے بھاگتے راستے میں کسی چیز سے ڈر کر بدکا۔ اور شہزادی ایک سخت جھٹکے کے ساتھ نیچے گر پڑی۔ اس کا پاؤں رکاب میں پھنس گیا تھا اس لئے وہ کچھ دور تک جنگل کی خاردار جھاڑیوں میں گھسٹتی چلی گئی۔ اتنے میں اس کے ساتھی آپہنچے۔ شہزادی کا جسم لہولہان تھا۔ اسے شدید چوٹیں آئی تھیں اور بہت سا خون بہہ جانے کی وجہ سے بے ہوش ہوگئی تھی۔

جب شہزادی کو محل میں لایا گیا تو ہر طرف کہرام مچ گیا۔ کئی روز تک کوششیں کی گئیں۔ منتیں، دعا تعویذ، علاج معالجہ سب کچھ کرایا گیا مگر شہزادی کو ہوش نہ آیا بلکہ حالت دن بدن بگڑنے لگی۔

سارسوں کی عادت ہے کہ کبھی کبھی بڑی اونچی عمارتوں کی چھتوں پر بھی گھونسلے بناتے ہیں۔ اسی طرح سارس کے ایک جوڑے نے شاہی محل کی سب سے اونچی برجی پر اپنا گھونسلا بنا رکھا تھا۔

سارسوں کا ایک بادشاہ تھا۔ وہ سال میں ایک بار دور قطب شمالی کے قریب برفانی علاقے میں کمپٹکا جھیل کے قریب دربار منعقد کرتا۔ اس دربار میں دنیا کے گوشے گوشے سے سارس آکر اپنے اپنے علاقے کے حالات بیان کرتے۔

شاہی محل کی چھت پر رہنے والے سارسوں نے شہزادی کو زخمی حالت میں لائے جانے اور پھر علاج معالجے کے لئے دوڑ دھوپ دیکھی تو انہیں بڑا ترس آیا۔ ایک روز دونوں شاہی خواب گاہ کی کھڑکی کے پاس آئے اور کھڑکی کے شیشے پر چونچیں مارنے لگے۔ بادشاہ نے کھڑکی کھولی تو سارس نے کہا۔

"جہاں پناہ۔ ہم آپ کی پریشانی دیکھ رہے ہیں۔ اور ہمیں اس کا بڑا دکھ ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اپنے بادشاہ کے دربار میں جاکر احوال بیان کریں۔ شاید وہاں دنیا کے کسی ملک سے کوئی اور سارس آیا ہو جسے شہزادی کی بیماری کی دوا معلوم ہو۔ مگر ایک شرط ہے۔"

"کیا شرط ہے جلدی بتاؤ۔" بادشاہ نے پوچھا۔ "مجھے ہر شرط قبول ہے۔ بس کسی طرح میری بیٹی کا علاج کرو کہ اسے صحت ہو۔"

"جہاں پناہ اپنی سلطنت میں حکم جاری کر دیں۔" سارس بولے "کہ کوئی شخص سارسوں کو اذیت نہ دے۔" "منظور ہے۔" بادشاہ نے کہا اور فوراً اعلان جاری کرنے کا حکم دے دیا۔

اسی روز دونوں سارس اپنے بادشاہ کے ملک کی طرف اڑ گئے۔ کئی روز دن رات اڑتے اڑتے آخر وہ کھٹکا جھیل کے قریب پہنچ کر اترے۔ دربار لگا ہوا تھا۔ دور دراز ملکوں سے سارس آئے ہوئے جمع تھے۔ کوئی چین اور جاپان سے تو کوئی افریقہ کے ملکوں سے کوئی امریکہ اور انگلینڈ سے۔

"اور سعودی عرب سے دادا ابو۔ جہاں پھوپی جان ہیں؟" فہد بولے۔

"ہاں۔ ہاں۔ وہاں سے بھی۔" دادا ابو نے جواب دیا۔

"بڑی بھیڑ تھی۔ غرض کہ یہ دونوں سارس کئی دنوں کے بھوکے پیاسے تھکے ماندے اترتے ہی مجمع کو چیرتے ہوئے بڑی مشکل سے اپنے بادشاہ کے محافظ کے پاس پہنچے اور بادشاہ کو پیغام دیا کہ ایک انسان کی زندگی اور موت کا سوال ہے اور جب بادشاہ نے اپنے سامنے بلایا تو سارس کے جوڑے نے سارا واقعہ سنا کر آخر میں کہا۔

"بادشاہ سلامت۔ ہم نے شہزادی کے علاج کے بدلے میں انسانوں کے ملک کے بادشاہ سے یہ وعدہ لے لیا ہے کہ اب اس کی سلطنت میں کوئی شخص سارسوں کو تکلیف نہیں پہنچائے گا۔ اس لئے یہ بہت ضروری ہے کہ کسی نہ کسی طور سے شہزادی کے علاج کا بندوبست کیا جائے۔"

سارسوں کا بادشاہ شہزادی کے حادثے کی تفصیل سننے کے بعد تھوڑی دیر تک گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ پھر بولا۔ "تم دونوں نے جو کیفیت بیان کی ہے اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ صورت حال یقیناً بہت گمبھیر ہے۔ میرے اندازے کے مطابق تو اب شہزادی کا صرف ایک علاج ہے۔ وہ یہ کہ دنیا کی آخری حد کے قریب جاکر کوئی آبِ حیات اور آبِ موت لائے اور وہ دونوں پانی شہزادی کو پلائے جائیں۔"

"مگر جہاں پناہ۔ دنیا میں کون ایسی چڑیا ہے جو وہاں جاسکے؟" خادم خاص بول اٹھا "وہاں جانے

سے موت یقینی ہے چوں کہ ان دونوں پانیوں کے چشمے کورسان کی چٹانوں کے درمیان پھوٹتے ہیں۔"

پہلے تو ہنزہ سے آئے ہوئے سارسوں نے خود جانے پر آمادگی ظاہر کی مگر پھر وہاں کے سفر اور پانی کے حصول میں رکاوٹوں کی تفصیل سن کر دونوں نے کانوں پر ہاتھ رکھا۔

سارسوں کا بادشاہ بولا۔ "اچھا ہے جو تم نے معذرت کرلی۔ میں بھی خود وہاں کبھی نہیں گیا۔ مگر سنا ہے کہ دنیا کے بالکل آخری کنارے کے قریب ایک بہت بڑا سمندر ہے اس کے اس پار ....."

"مگر فہد میاں تو اونگھ رہے ہیں۔ ایسے میں کہانی کون سنے گا۔؟" دادا ابو کہانی کا سلسلہ توڑ کر بولے۔

"مگر میں تو جاگ رہی ہوں۔ دادا ابو" تحریم بولیں۔ اتنے میں فہد بھی جاگ گئے۔

"اچھا اب میں جاگ گیا۔ دادا ابو۔" فہد نے کہا۔ "اب نہیں سوؤں گا۔"

"تو سارس کے بادشاہ نے کہا" دادا ابو نے کہانی پھر وہیں سے شروع کی۔ "کہ دنیا کے بالکل آخری کنارے پر جو سمندر ہے اس کے پار ہر طرف برفانی چٹانیں ہوتی ہیں۔ ان میں دو چٹانیں سب سے اونچی اور خطرناک ہیں۔ انہیں کورسان کی چٹانیں کہتے ہیں۔ ان چٹانوں کے بیچ درمیان ایک کھائی ہے۔ بہت گہری۔ تقریباً ایک ہزار فٹ گہری مگر دونوں چٹانوں کے درمیان فاصلہ بہت تنگ ہے بس زیادہ سے زیادہ دس فٹ۔ یعنی بس اتنا جتنی کہ ہمارے مکان کے سامنے فٹ پاتھ ہے۔ اس کھائی کی تہ میں سے دو چشمے پھوٹتے ہیں۔ ایک سے حیات کا پانی نکلتا ہے۔ دوسرے سے موت کا۔ موت کے پانی کی خاصیت یہ ہے کہ اگر اسے کسی مردے پر ڈالا جائے تو اس سے تمام زخم بھر جاتے ہیں اور ٹوٹی ہوئی ہڈیاں جڑ جاتی ہیں اور پھر آب حیات اس شخص کو زندہ کر دیتا ہے۔

لیکن آج تک میں نے نہیں سنا کہ کوئی وہاں جاکر پانی لے کر زندہ واپس آیا ہو کیوں کہ کورسان کی چٹانوں پر ایک طلسم ہے۔ وہ دن رات آپس میں ٹکراتی رہتی ہیں یہاں تک کہ کوئی ننھی چیز بھی اگر دونوں چٹانوں کے بیچ میں آجائے تو پس کر میدہ بن جائے گی۔

سارس کے بادشاہ کی باتیں سن کر مجمع پر خاموشی طاری ہوگئی۔ تمام سارس خاموش کھڑے سر جھکائے اپنے پروں کو چونچ سے کھجا رہے تھے جیسے انسان سے جب کچھ جواب نہیں بن پڑتا ہے تو سر کھجانے لگتا ہے۔ اتنے میں سب کے پیچھے سے مجمع کو چیرتا ہوا ایک بڈھا خرانٹ سارس لنگڑاتا ہوا آگے آیا۔ اس کے بہت سے پَر جھڑے ہوئے تھے۔ ایک آنکھ بھی ضائع ہوگئی تھی اور ایک ٹانگ سے بھی معذور

تھا۔ لنگڑا سارس بادشاہ کے قریب آکر کہنے لگا۔

"بادشاہ سلامت۔ میں آپ کے لئے وہاں جاؤں گا۔ اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ بہت دنیا دیکھ لی ہے۔ ایک انسان کی جان بچانے کی کوشش میں اگر میں مر بھی گیا تو کوئی ہرج نہیں۔ مجھے اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ہاں ملے گا۔ آپ صرف اتنا حکم دیں کہ میری ٹانگوں میں دو چھوٹی چھوٹی بوتلیں باندھ دی جائیں اور راستے میں کھانے کے لئے کچھ دانے ایک پوٹلی میں باندھ کر میرے گلے میں لٹکا دیئے جائیں۔"

بادشاہ نے جب دیکھا کہ بوڑھا سارس جانے کا پکا ارادہ کئے ہوئے ہے اور کسی طرح باز نہیں آتا تو اس نے سارس کی ٹانگوں میں شیشیاں بندھوا دیں اور جتنا کھانا وہ گردن میں اٹھا سکتا تھا بندھوا دیا۔ ادھر بوڑھا سارس رخصت ہوا ادھر سارس کے بادشاہ نے ہنزہ سے آئے ہوئے دونوں سارسوں کو کہا کہ واپس جاکر وہاں کے بادشاہ کو پیغام دے دیں کہ ان کی بیٹی کے علاج کے لئے انتظام کیا جارہا ہے۔ آگے اللہ تعالیٰ کی جو مرضی۔

کئی ہفتے بوڑھا سارس پہاڑوں، جنگلوں، میدانوں پر سے اڑتے اڑتے آخر برف سے ڈھکے ہوئے سمندر کے پار جا پہنچا۔ دور سے اسے دو برف کی اونچی چٹانیں نظر آئیں جو بار بار زور زور سے آپس میں ٹکرا رہی تھیں۔ ان کی ٹکر سے دور دور تک بڑے زور کے دھماکے کی آواز آتی اور آس پاس ایک ایسا طوفان تھا کہ سارس کو اپنے بازوؤں پر قابو رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ بار بار نزدیک جانے کی کوشش کرتا اور پھر ہوا کے دھکے سے پیچھے چلا جاتا۔ آخر بڑی دیر کے بعد وہ ایک بار بہت اونچا اڑ کر چٹانوں کے اوپر کی طرف گیا۔ اوپر سے دونوں چٹانوں کے بیچ میں جو جھانکا تو بہت گہرائی میں اسے موت اور حیات کے چشموں کے پانی کی چمک نظر آئی۔

سارس ابھی اوپر اڑتا ہوا سوچ ہی رہا تھا کہ اب کیا کرنا چاہئے کہ اتنے میں قریب سے اسے آواز آئی۔ جیسے کوئی کہہ رہا ہے ٹھہرو۔ جان کے دشمن نہ بنو۔ سارس نے مڑ کر دیکھا تو ایک ابابیل تھا۔

"خبردار نیچے ہرگز نہ جانا۔ ذرا نیچے گئے کہ چٹانوں کی ٹکر سے اٹھتی ہوئی طوفانی ہوائیں تمہیں اپنی طرف کھینچ لیں گی اور پھر تم پس کر سفوف ہو جاؤ گے۔" ابابیل کہہ رہا تھا۔

"تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ مجھے ایک انسان کی جان بچانی ہے۔ چاہے اپنی جان چلی جائے۔" سارس کہنے لگا۔

"تمہارا ارادہ تو بہت نیک ہے" ابابیل نے کہا۔ "اور میں بھی تمہاری کامیابی کے لئے دعا کروں گا۔ مگر ہمیشہ احتیاط کرنا چاہئے۔ جان بوجھ کر خود کو ہلاکت میں ڈالنا کہاں کی عقل مندی ہے؟ تمہارے لئے صرف ایک راستہ ہے روز دوپہر کو آدھ گھنٹے کے لئے چٹانیں ذرا آرام کرنے کے لئے تھم جاتی

ہیں۔ اس وقت کا انتظار کرو۔ اور جب دیکھو کہ چٹانیں ٹکراتے ٹکراتے تھوڑی دیر کو رک گئی ہیں تو چٹانوں کے اوپر کھائی کے ٹھیک اوپر اڑ کر پہنچو اور پھر سیدھے نیچے کی طرف اس طرح پروں کو موڑ کر چھلانگ لگاؤ جیسے کوئی پتھر کا ٹکڑا نیچے گرتا ہے چٹانوں کی دیواروں کو ذرا سی ٹھیس لگی تو وہ فوراً جاگ اٹھیں گی اور پھر تمہارا خاتمہ ہے پیس کے رکھ دیں گی تمہیں۔"

"اتر تو جاؤں گا جیسے تم نے بتایا مگر واپس کیسے آؤں گا؟ اوپر اڑنے کے لئے تو پَر پھیلانے ہی پڑیں گے" سارس نے پوچھا۔

"یہ میں نہیں بتا سکتا۔ تمہیں خود کوئی ترکیب سوچنی ہوگی" یہ کہہ کر ابابیل اڑ کر ہوا میں غائب ہوگیا۔ ابابیل کے جانے کے تھوڑی دیر بعد سارس نے دیکھا کہ فضا میں ایک خاموشی سی چھا گئی۔ شور بند ہوگیا۔ پلٹ کر دیکھا تو دونوں چٹانیں بالکل خاموش کھڑی تھیں ۔ سارس کا دل شوق سے بلیوں اچھل رہا تھا۔ وہ جس مقصد کے لئے اتنی دور آیا تھا اس میں کامیابی قریب تھی۔ وہ اڑا دونوں چٹانوں کے درمیان آیا۔ بازوؤں کو بند کیا اور پھر اللہ کا نام لے کر غار میں چھلانگ لگا کر سیدھا اترنے لگا۔ تھوڑی دور اندر گیا ہی تھا کہ اس پر خوف طاری ہونے لگا۔ راستہ نہایت تنگ تھا۔ ایک نالی کی طرح۔ دونوں طرف چٹانوں سے نوک دار پتھر نکلے ہوئے تھے۔ اگر ذرا سی ٹھیس لگے تو کام تمام۔ گھبرا کر سارس نے سوچا کہ واپس باہر چلا آئے۔ مگر پھر اسے خیال آیا کہ وہ ایک نہایت نیک کام کے لئے آیا ہے۔ اس کے دل نے کہا کہ اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا۔ یہ سوچ کر وہ اترتا گیا۔

سارس نے نیچے نظر دوڑائی تو دونوں چشموں کے بیچ ایک پتھر ابھرا ہوا تھا۔ وہ اسی پتھر پر اتر گیا۔ اور پھر ایک بار ایک طرف موت کے چشمے سے دوسری طرف زندگی کے چشمے سے دونوں شیشیاں بھریں۔ یہ کام بھی آسان ہوگیا۔ شیشیاں تو ٹانگوں میں بندھی ہی ہوئی تھیں بس ٹانگ کو شیشی سمیت چشمے میں ڈبویا اور پانی بھر گیا۔

سارس کو اندازہ نہیں تھا کہ پانی بھرنے کے بعد شیشیاں بھاری ہوجائیں گی۔ اب اسے اوپر اڑنے میں بڑی دقت محسوس ہو رہی تھی۔ ایک بار تو قریب تھا کہ وہ ذرا آرام لینے کے لئے ایک طرف چٹان سے باہر نکلے ہوئے ایک پتھر پر رک جاتا فوراً اسے خیال آیا کہ ایسا کرنے سے موت یقینی ہے۔ اور پھر وہ اڑتا گیا۔

ابھی وہ چٹانوں کے دہانے سے تھوڑی دور اندر ہی تھا کہ باہر سے سورج کی ایک شعاع سیدھی اس کی آنکھ پر پڑی۔ بے چارے کی ایک ہی تو آنکھ تھی۔ شعاع یکایک آنکھ میں پڑنے سے وہ بوکھلا کر آنکھ جھپک کر پیچھے ہٹا۔ اس کا ایک بازو اتنے میں چٹان کی دیوار سے چھو گیا۔ اب وہ چٹانوں کے

دہانے پر پہنچ گیا تھا۔ اس کے بازو سے چھو کر چٹان سے ایک پتھر کا ٹکڑا الگ ہو کر نیچے گرا۔ بس پھر کیا تھا۔ فوراً دونوں چٹانیں بڑے زور کے دھماکے کے ساتھ آپس میں ملنے کے لئے آگے بڑھیں۔ سارس کو سب سے زیادہ فکر پانی کی شیشیوں کی تھی۔ اس نے اپنی ٹانگوں کو اوپر اٹھا کر اڑنے کی کوشش کی۔ ترچھے ہونے کی وجہ سے اس کی دم کے پروں کا گچھا نیچے کی طرف لٹکتا رہا۔ اس نے اوپر ایک جست لگائی۔ ادھر چٹانوں کے دونوں کنارے زور سے ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ سارس کی دم کے پَر ان کے بیچ میں آ گئے۔ اوپر آ کر سارس نے دیکھا کہ جب چٹانوں کا منھ کھلا تو اس کی دم ننھے ننھے ٹکڑے ہو کر ہوا میں اڑ رہی تھی۔

سارس دو روز سے بھوکا تھا مگر کامیابی پر بہت خوش تھا۔ وہ پوری قوت سے اڑتا ہوا اپنے بادشاہ کے حضور پہنچا۔ اس کی نچی ہوئی دم اور پروں کو دیکھ کر دوسرے سارس زور سے ہنسنے اور پھبتیاں کسنے لگے۔ مگر بڈھا سارس کسی کی پروا کئے بغیر بادشاہ کی طرف بڑھتا گیا۔ قبل اس کے کہ دوسرے سارس مذاق میں اس کی شیشیاں توڑ دیں بادشاہ کی نظر اس پر پڑ گئی۔ بادشاہ نے بڑی گرج دار آواز میں کہا۔ "خاموش!" اور تمام سارس فوراً اپنی اپنی جگہ چپ کھڑے رہ گئے۔

بادشاہ بوڑھے سارس کے قریب آیا اس کے پاؤں سے پانی شیشیاں کھلوائیں۔ اسے گلے لگایا۔ اور پھر مجمع سے مخاطب ہو کر بولا۔

"جب اگر کبھی تم خود کو رسان کی چٹانوں کے اندر جا کر باہر آ جاؤ تو پھر ایک دوسرے پر خوب ہنس لینا مگر اس وقت تمہاری بداخلاقی کی یہی سزا ہے کہ تمہاری دم بھی بغیر پروں کے اسی طرح ٹنڈ منڈ ہو جیسے اس بہادر سارس کی ہے۔"

بادشاہ کا یہ کہنا تھا کہ تمام سارسوں کی دموں کے پر جھڑ کر گر گئے۔ اس دن سے آج تک سارس کی دم میں پَر بڑے نہیں ہوتے۔

دونوں شیشیاں فوراً ہنزہ کے بادشاہ کو بھیج دی گئیں۔ اور شہزادی تندرست ہو گئی۔ اور بادشاہ کے محل میں ان دو سارسوں کی بڑی قدر ہونے لگی جن کی کوشش سے شہزادی کی زندگی دوبارہ واپس آئی تھی۔ "پھر کیا ہوا۔" فہد میاں پوچھنے لگے۔

"گڈے۔ پھر یہ ہوا کہ کہانی ختم ہو گئی۔ اور اب آپ کو سونا ہے۔" دادا ابو بولے۔

"اور دوسری؟" فہد نے پھر کہا۔ "ہاں دادا ابو دوسری؟" تحریم نے تائید کی۔

"دوسری کل۔ اب شب بخیر۔ اللہ حافظ" دادا ابو نے دونوں کو تھپک کر کہا۔ اتنے میں دونوں سو گئے۔ اور دادا ابو آہستہ سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

سیرتِ طیبہؐ پر لکھی جانے والی معرکتہ الآرا کتاب جسے بطورِ خاص

بچّوں اور طالب علموں کے لیے تحریر کیا گیا

مشہور محقق سیّد نظر زیدی کا تحفۂ خاص، جس نے صدارتی ایوارڈ حاصل کیا

سب سے بڑا انسانؐ

- سیرتؐ کے موضوع پر بیش بہا معلومات
- عام فہم، آسان اور دلنشیں اندازِ تحریر
- ۱۹۰ حسین آفسٹ صفحات،
- دلکش کمپوزنگ، عمدہ طباعت
- چار رنگوں کا حسین اور لیمینیٹڈ سرورق

الحمدللہ

اس خوبصورت کتاب کو شائع کرنے کی سعادت ادارہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی نے حاصل کی۔

ھدیہ :- (چالیس ۴۰ روپے) (منی آرڈر یا پوسٹل آرڈر کی شکل میں بھجوائیں)

ڈاک خرچ ادارے کے ذمّے ہوگا۔

نوٹ

طلبہ و طالبات اپنے ادارے کے شناختی کارڈ کی فوٹو اسٹیٹ بھجوا کر یہ کتاب ۲۵ روپے میں حاصل کر سکتے ہیں

کتاب منگوانے کا پتہ :-

ایک عظیم شخصیت جو اندھی بہری اور گونگی تھی

محمد سلمان صدیق احمد خان سنبل

مارک ٹوئن نے ایک بار کہا تھا "انیسویں صدی کی دو سب سے دلچسپ شخصیات نپولین اور ہیلن کیلر ہیں"۔ مارک ٹوئن نے یہ بات اس وقت کہی تھی جب ہیلن کیلر کی عمر صرف پندرہ برس تھی۔ آج بھی وہ بیسویں صدی کی عظیم ترین شخصیات میں سے ایک ہے۔

ہیلن کیلر بالکل نابینا تھی۔ اس کے باوجود اس نے اتنی کتابیں پڑھی ہیں جتنی بہت سے آنکھوں والے بھی نہیں پڑھ سکتے۔ ایک عام شخص سے اس نے سوگنا زیادہ کتابیں تو ضرور پڑھی ہوں گی۔ وہ سات کتابوں کی مصنف بھی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کے بارے میں ایک فلم بھی بنائی تھی اور اس میں خود ہی کام کیا تھا۔ وہ بالکل بہری تھی مگر ان لوگوں سے کہیں زیادہ موسیقی سے لطف اندوز ہوتی تھی جن کے کان اچھے بھلے تھے۔ اپنی زندگی کے نو برس وہ قوت گویائی سے محروم رہی اس کے باوجود اس نے یونین کی ہر ریاست میں تقریریں کیں۔ وہ پورے یورپ کا چکر لگا چکی تھی۔

ہیلن کیلر پیدا ہوتے وقت بالکل نارمل تھی۔ اپنی زندگی کے پہلے ڈیڑھ برس میں وہ دوسرے بچوں کی طرح دیکھ، سن اور بول سکتی تھی پھر یکایک ایک بیماری نے اسے بری طرح متاثر کیا کہ انیس مہینے کی عمر میں وہ گونگی، بہری اور اندھی ہو گئی۔ تندرست ہونے کے بعد وہ جنگلی جانوروں جیسی حرکات کرنے لگی۔ جو چیز اسے بری لگتی اسے توڑ دیتی۔ دونوں ہاتھوں سے کھانا اپنے منہ میں ٹھونس لیتی، اگر اسے کوئی روکتا تو زمین پر لیٹ کر زور زور سے لاتیں مارتیں اور چیخنے کی کوشش کرتی۔ انتہائی مایوسی کے عالم میں اسکے والدین نے اسے بوسٹن میں اندھوں کے انسٹی ٹیوٹ میں بھیج دیا۔ پھر اسکی تاریک زندگی میں این میںسفیلڈ سلی ون روشنی کی دیوی کی طرح داخل ہوئی۔ مس سلی ون بوسٹن میں پرکن انسٹی ٹیوٹ سے تعلیم مکمل کر کے صرف بیس برس کی عمر میں ایسا کام شروع کر بیٹھی جو بالکل ناممکن نظر آتا تھا۔ یعنی گونگے، بہرے، اندھے بچے کو تعلیم دینا۔ اس کی اپنی زندگی بہت غربت اور دکھ میں گزری تھی۔

این سلی ون کو دس برس کی عمر میں چھوٹے بھائی کے ساتھ ٹیوکس بری میں چیوسٹس کے یتیم خانے میں بھیج دیا گیا۔ اس جگہ لوگوں کی اتنی بھیڑ تھی کہ یہ دونوں بچے مردہ خانے میں سوتے تھے۔ اس کا چھوٹا بھائی خوف سے چھ ماہ بعد مر گیا۔ این جب چودہ برس کی ہوئی تو اسکی بینائی اتنی کمزور ہو گئی کہ اسے انگلیوں کے لمس سے پڑھنا سکھانے کے لئے پرکن انسٹی ٹیوٹ بھیجا گیا۔ مگر وہ اندھی نہ ہوئی۔ اس واقعہ کے بچاس برس بعد اور موت سے چند روز پہلے وہ بالکل نابینا ہو گئی۔ مصنف ڈیل کارنیگی کہتا ہے کہ میں یہ بتانے سے قاصر ہوں کہ این نے ہیلن کیلر پر کیا جادو کیا اور اس طرح وہ ایک ماہ ہی میں ایسے بچے سے تبادلہ خیالات کرنے میں کامیاب ہو گئی جو مکمل تاریکی اور خاموشی کی دنیا میں گم تھا۔ ہیلن کیلر کی اپنی کتاب "میری داستان حیات" میں یہ واقعات تفصیل سے ہیں۔ بیس سال کی عمر میں ہیلن کیلر نے اتنا کچھ سیکھ لیا کہ اسنے ریڈ کلف کالج میں داخلہ لے لیا۔ اس کی استانی بھی ہمراہ گئی۔ اس وقت تک اس نے کالج کے دیگر طلباء و طالبات کی طرح نہ صرف لکھنا پڑھنا سیکھ لیا بلکہ اسکی قوت گویائی بھی بحال ہو گئی تھی۔ اس نے زندگی میں جو پہلا جملہ سیکھا تھا وہ یہ تھا۔ "میں اب گونگی نہیں ہوں"۔ اس حقیقت کے اظہار سے وہ بے حد خوش ہوتی تھی۔ اس کا لب و لہجہ اس غیر ملکی زبان بولنے والے شخص کی مانند تھا جسے زبان پر عبور حاصل نہ ہو۔ وہ ٹائپ رائٹر سے لکھتی جو ابھرے ہوئے لفظوں میں ٹائپ کرتا تھا۔ وہ نیویارک شہر کے ایک علاقے فلرسٹ بلز میں رہتی تھی۔ مصنف ڈیل کارنیگی کہتا ہے کہ "میں جب بھی سیر کے لئے گھر سے نکلتا تو اسے اکثر اپنے کتے کے ساتھ باغ میں سیر کرتے دیکھتا۔ وہ اپنے آپ سے اشاروں میں باتیں کرتی تھی۔ اسکی سیکرٹری نے مجھے بتایا کہ مس کیلر میں سمت اور رخ کا اندازہ کرنے کی حس ہم میں سے کسی سے بہتر نہیں۔ وہ اکثر اپنے گھر ہی میں راستہ بھول جاتی۔ اور میزیں کرسیاں ادھر ادھر کرنے سے اسے مشکل

ہوتی۔ اسکے باوجود وہ اپنے دوستوں کے ہونٹوں پر آہستہ سے انگلی رکھ کر یہ جان لیتی کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ اسی طرح وہ پیانو اور وائلن کے دستے پر انگلیاں رکھ کر موسیقی سے لطف اندوز ہوتی۔ وہ مشین کے ارتعاش کو محسوس کر کے وائرلیس کا پیغام سمجھ لیتی۔ اگر ہیلن کیلر آج آپ سے ہاتھ ملائے اور پھر پانچ برس بعد ملائے تو وہ یہ جان سکتی تھی کہ آپ غم زدہ ہیں یا مایوس یا خوش"۔ وہ تیرتی تھی کشتی کرتی اور شطرنج کھیلتی تھی۔ ہم میں سے اکثر یہ کہتے ہیں کہ اندھاپن بڑی لعنت ہے۔ مگر وہ کہتی تھی کہ اسے اندھا ہونے سے زیادہ بہری ہونے کا غم ہے۔ وہ انسانی آواز کے ہمدردانہ لہجہ کے لئے سب سے زیادہ ترستی تھی۔

ایک نایاب اور یادگار تصویر

معمار پاکستان، مستقبل کے معماروں کے ساتھ

مچھر اور بیل

عبدالقادر

ایک روز تھرکتا ہُوا مچھّر کسی گھر سے
باہر چلا سازینہ بجاتا ہوا پَر سے
اک بیل کو خاموش سا بیٹھا ہوا پایا
بس شوق سواری کا یونہی دل میں سمایا
بیٹھا وہ بڑے چاؤ سے اک سینگ کے اوپر
پھر اپنے خیالات میں گُم ہوگیا مچھر
جب دیر ہوئی بیٹھے ہوئے دل میں یہ سوچا
ہے ظلم بڑا بیل کو میں نے جو دبوچا
بے چارہ یہ پستا ہی رہا میرے بدن سے
میں نے تو اسے مار ہی ڈالا ہے وزن سے
احساس ندامت سے ہوا اتنا پشیماں
آواز دی مچھر نے مرا سخت ہے عصیاں
آ بیٹھا یہاں سینگ پہ بن مانگے اجازت
یوں بوجھ سے ڈھائی ہے بہت تم پہ قیامت

بے جُرم و خطا آج تمہیں میں نے ستایا
یہ جور و ستم ہے کہ تمہیں اتنا دبایا
شکوہ نہ کیا آپ نے ازراہِ محبّت
یوں کچلے رہے، اف نہ کہا، خوب مروّت
جب بیل نے آواز سنی، دیدے اٹھائے
پھر کہنے لگا شکریہ تشریف جو لائے
پہلے تو مجھے بات یہ بتلاؤ مری جاں
کس سینگ پہ بیٹھے ہو مرے ننھّے سے مہماں
یہ بھی نہ خبر مجھ کو ہوئی آئے ہو کب تم
احساس ذرا سا نہ ہوا بیٹھے ہو جب تم
یہ تم نے گماں کیسے کیا تم بنے زحمت
اے جانِ جگر تم ہو خدا کی بڑی رحمت
تم دل میں جہاں بھر کے یونہی غم نہ سمیٹو
چاہو تو بڑے شوق سے اس سینگ پہ لیٹو
بخشا ہے شرف سینگ کو یوں کر کے بسیرا
تم ہو مری تاریک سی دنیا کا سویرا
مہماں کی ضیافت کی رہی بات الگ ہی
ہے مجھ کو ندامت کہ تمہاری نہ خبر لی
سو سینگ کروں تم پہ نچھاور مرے مہماں
یہ میرا نہیں سینگ تمہارا ہے مری جاں

کتنا مال تجوری میں ہے؟ ایک متجسس چمپینزی

نئے لکھنے والوں کی مختصر تحریروں کا مستقل سلسلہ

لکھنے سے پہلے پڑھنے کی باتیں

آپ اگر واقعی کم سن ہیں تو مختصر تحریروں کا یہ سلسلہ آپ ہی کے لئے ہے۔ یاد رہے کہ صاف، خوشخط اور مختصر ترین تحریریں جلد شائع ہوسکیں گی۔ جس تحریر کی پشت پر قلم کار کا نام پتا درج نہ ہوگا اُسے مایوسی ہوگی۔ نقل شدہ تحریروں کی سزا "بلیک لسٹ" برقرار رہے گا۔ کم سن قلم کار چاہیں تو اپنی تحریروں کے ساتھ اپنی تصاویر بھی بھجوا سکتے ہیں۔ تصویر اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔ قلم کار ساتھی آنکھ مچولی میں شائع ہونے والا نوٹس بورڈ وقتاً فوقتاً ضرور پڑھتے رہا کریں۔ کم سن قلم کار میں شائع ہونے والی تحریروں کو آنکھ مچولی کی اعزازی کاپی روانہ کی جائے گی۔ (ادارہ)

پاکستان

فہد ارشد علی، سعودی عرب

میرا دل ہے میری جان
میری عزت میری شان
میرے اللہ کا احسان
میرا دیس ہے پاکستان،
میرے دیس کے پرچم پیارے
دیکھے آئیں چاند اور تارے
جو بھی دیکھے وہ دل ہارے
میں اس کے صدقے قربان
میرا دیس ہے پاکستان
آؤ مل کر کام کریں ہم
پاکستان روشن اس کا نام کریں ہم
پاکستان پیار محبت عام کریں ہم
یہی ہے قائد کا فرمان
میرا دیس ہے پاکستان
پاکستان۔

سو روپے اور سو دوست

دبئی ارشاد قریشی، ڈیرہ اسمٰعیل خان

"بجائے اس کے کہ تمہارے پاس سو روپے ہوں۔ اگر تمہارے پاس سو پُر خلوص دوست ہوں تو اچھا ہے!"

میں چونک اٹھا اور اپنے قریب بیٹھے گروپ کو دیکھا جن میں ضیاء نمایاں تھا اور لڑکے اس کی باتیں بغور سن رہے تھے!

ضیاء ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ کالج کے لڑکوں میں بہت مقبول تھا۔ اس کی وجہ اس کا اچھا اخلاق اور مسکراتا چہرہ تھا۔ کالج کا تقریباً ہر لڑکا اس کا دوست تھا اور وہ ہر ایک کے ساتھ خلوص سے پیش آتا تھا۔ میں یعنی احمد یار خان ایک صنعت کار کا بیٹا کالج میں کبھی کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا۔ ہر وقت اپنی امیری کے غرور میں اکڑا رہتا تھا اس لئے میرے دوست بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہی تھے۔ میں زیادہ تر تنہا رہتا تھا۔

گھنٹی ہو چکی تھی لڑکے اٹھ کر کلاس میں جا چکے تھے۔ میرا پیریڈ فارغ تھا اس لئے میں گھر چلا آیا میرے کانوں میں ابھی تک ضیاء کی بات گونج رہی تھی۔ مجھے ضیاء کی اس بات سے ہر طرح سے اختلاف تھا۔ بھلا دولت اور دوستوں کا کیا مقابلہ۔ برے وقت میں دوست کبھی کام نہیں آتے۔ دولت سے ہر چیز خریدی جا سکتی ہے۔ میں یہ بات سوچتا رہا شام کو گھر پر پاپا نے مجھے کچھ کاغذ دیئے اور بتایا کہ میرا داخلہ انہوں نے امریکہ کے ایک اچھے کالج میں کروا دیا ہے اور مجھے اب جانے کی تیاری کرنی ہے ایک ہفتے بعد میں اچھے مستقبل اور کامیاب زندگی کے لئے امریکہ چلا آیا۔ لیکن میں آنے سے پہلے ضیاء سے نہ مل سکا۔

یوں وقت گزرتا گیا اور میں دس سال بعد ایم۔ بی۔ اے کی ڈگری کے ساتھ وطن واپس آیا اور پاپا کے بزنس میں ان کا ہاتھ بٹانے لگا۔ ایک دن مجھے ضیاء کا ایک دوست ملا۔ میں نے اس سے ضیاء کے بارے میں پوچھا اس نے کہا مجھے نہیں معلوم لیکن اتنا جانتا

ہوں کہ ایف۔ ایس۔ ای میں اچھے نمبر آنے کے باوجود انجینئرنگ میں داخلہ نہیں لے سکا کیونکہ ایک حادثے میں اس کے والد کا انتقال ہوگیا۔ دو بہنوں اور ماں کا پیٹ پالنے کے لئے اسے کالج چھوڑنا پڑا اب وہ کہاں ہے مجھے نہیں معلوم۔

میں سوچنے لگا کہ ضیاء اگر تم ایک مرتبہ مل جاؤ تو میں تم سے اس بات کا مطلب پوچھنا چاہتا ہوں جو تم نے دس سال قبل کہی تھی!

ایک دن میں بزنس پارٹی سے مل کر ہوٹل کے کار پارکنگ ایریا تک آیا تو سامنے سے آتی ہوئی سفید کار کو دیکھ کر چونک اٹھا کیونکہ گاڑی سے اترنے والا سو فیصدی ضیاء تھا۔ ضیاء نے مجھے دیکھا شاید اس نے مجھے پہچان لیا وہ جلدی سے میرے نزدیک آیا

"تم احمد یار خان ہونا" ضیاء نے حسب عادت مسکراتے ہوئے کہا میں نے کہا "تم نے ٹھیک پہچانا اور تم ضیاء ہو؟"

"شکر ہے تم نے مجھے پہچان لیا" ضیاء نے بڑے خوشی بھرے لہجے میں کہا اس کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔

اور سناؤ ضیاء کیسے ہو؟ میں نے سنا تھا کہ تم نے ایف۔ ایس۔ ای کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ ویسے آج کل تم کیا کر رہے ہو؟" یہ سوال میں نے اس تجسس کی بنا پر کئے تھے کہ میں ضیاء کے قیمتی کپڑے اور اس کی نئے ماڈل کی کار دیکھ کر حیران تھا۔

"یار! تم نے اکٹھے بہت سارے سوال کر دیئے۔ چلو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں نے کتنی جدوجہد کے بعد یہ مقام پایا ہے۔ لیکن تمہیں میرے ساتھ ایک کپ چائے پینا ہوگی۔ کہو منظور؟" ضیاء نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

میں نے کہا کہ چلو منظور۔ ہم دونوں ہوٹل میں آکر بیٹھ گئے اور ضیاء نے بیرے کو چائے کا آرڈر دیا۔

چائے پیتے ہوئے ضیاء نے بتایا کہ "والد کی وفات کے بعد آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ مین کسی بھی طرح تعلیم جاری نہیں رکھ سکتا تھا سو میں نے کالج چھوڑ دیا۔ جب میرے دوستوں کو یہ بات پتہ چلی تو انہوں نے مجھے ایسا کرنے سے روکا اور آپس میں پیسے جمع کر کے مجھے انجینئرنگ کالج میں داخلہ دلوادیا۔ میرے ایک دوست نے مجھے اپنے جنرل اسٹور پر کام دیا۔ میں صبح کے وقت کالج جاتا اور شام کے وقت دوست کے جنرل اسٹور پر بیٹھنے لگا۔ اس کے علاوہ میرا ایک دوست جو رسالوں میں کالم لکھا کرتا تھا اس نے مجھے بھی اپنے ساتھ کام کرنے کی دعوت دی اور یوں میں نے سائنسی کالم لکھنے شروع کر دیئے۔ اس طرح مجھے اچھی خاصی آمدنی ہونے لگی میرے دوستوں نے میرا بہت ساتھ دیا۔

وقت گزرتا گیا میں نے انجینئرنگ اچھے نمبروں میں پاس کرلی اور ملک سے باہر چلا گیا۔ کچھ عرصہ بعد واپس آیا تو اپنے ہی ایک دوست کے ساتھ شراکت کر کے انجینئرنگ فرم کھول لی جو کہ بہت کامیاب رہی اور یوں میرے اچھے حالات نے برے حالات کو شکست دے دی۔ اگر میرے دوست میرا ساتھ نہ دیتے تو شاید میں اس مقام پر نہ ہوتا" ضیاء یہ کہہ کر خاموش ہوگیا میں نے ضیاء کے چمکتے ہوئے چہرے کو دیکھا اور کہا" ضیاء گویا وہ بات درست ثابت ہوئی جو تم نے دس سال پہلے کالج کے لان میں بیٹھ کر کہی تھی۔" "بجائے اس کے کہ تمہارے پاس سو روپے ہوں تمہارے پاس سو پر خلوص دوست ہوں تو بہتر ہے۔ یہ بات تو میں اب بھی کہتا

ہوں مگر تم ....." ضیاء نے حیران ہو کر کہا۔

میں نے کہا جب تم نے کالج کے لان میں یہ بات کہی تھی تو میں تمہارے گروپ کے نزدیک ہی بیٹھا تھا۔ دس سال سے یہ بات میرے کانوں میں گونج رہی تھی مگر اب تمہیں دیکھ کر تمہاری اس بات کا مطلب سمجھ گیا ہوں۔ آج سے ان سو دوستوں میں سے تم میرے پہلے دوست ہو" یہ سن کر ضیاء کے چہرے کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔

لاش کی بے حرمتی

ایس اے جاوید

مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، جب حجاج بن یوسف سے لڑ رہے تھے۔ تو ایک دن اپنی والدہ حضرت اسماء بنت ابو بکرؓ کے پاس آئے اور کہا! "ایک ایک کر کے میرے سب ساتھی شہید ہو گئے ہیں۔ اب فتح کی کوئی امید نہیں لیکن میں اگر چاہوں تو دشمن فوج کا سالار مجھے امان دے سکتا ہے۔ اس کے بارے میں آپ کا کیا مشورہ ہے؟" حضرت اسماء رضی اللہ عنہ نے فرمایا "بیٹا تو اگر حق پر ہے تو آخر وقت تک لڑتا رہ اور اگر ناحق پر ہے تو تو نے اپنا اور دوسروں کا ناحق خون بہایا۔" حضرت عبداللہ بن زبیر نے جواب دیا! "میں حق پر ہوں لیکن مجھے خوف ہے کہ شہید کرنے کے بعد دشمن میری لاش کی بے حرمتی کریں گے۔" یہ سن کر حضرت اسماءؓ نے جواب دیا "بیٹا جب بکری ذبح کر دی جاتی ہے۔ تو اسے کچھ پتا نہیں چلتا کہ اس کی کھال کس طرح اتاری گئی۔"

گفتگو کم کرنے کا طریقہ

محمد رمضان رجانی
فیصل آباد

زندگی کے رہنے سہنے کے اصولوں میں بول چال کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ انسانی زندگی میں بول چال کی اہمیت آنکھوں جیسی ہے۔ جس طرح کوئی شخص دنیا میں آنکھوں کے بغیر مکمل نہیں، اسی طرح انسانی زندگی بول چال کے بغیر ادھوری ہے۔ گفتگو کرنے کا فن ہر کوئی نہیں جانتا۔ کتنے ہی لوگ تعلیم کی اونچی اونچی ڈگر کے حامل ہونے کے باوجود گفتگو سے جاہل معلوم ہوتے ہیں اور کئی لوگ ان پڑھ ہوتے ہوئے بھی اپنی باتوں اور سوچوں سے اس قدر بلند لگتے ہیں کہ ان کے سامنے فلک جھکا جھکا لگتا ہے۔ لوگ ان کی سلجھی اور میٹھی گفتگو سے سمجھتے ہیں یہ کہ کافی پڑھے لکھے ہیں۔

گفتگو سے ہر انسان کی شخصیت اور اخلاق کا پتہ چلتا ہے حضورؐ کا ارشاد ہے کہ "یقیناً مومنوں میں بہ لحاظ ایمان زیادہ کامل وہ ہے جو اخلاق میں ان سے بہتر ہو"

گفتگو کرنا ایک فن ہے اور اس فن سے صرف وہی لوگ واقف ہیں جو اچھی اچھی جگہوں اور اچھے لوگوں کی صحبت میں بیٹھتے ہیں۔ ایک بادشاہ نے خواب دیکھا۔ بادشاہ نے شاہی نجومی کو بلوایا اور نجومی کو خواب سنایا۔ نجومی نے سوچنے کے بعد کہا کہ بادشاہ سلامت آپ عنقریب مر جائیں گے۔ بادشاہ نے اپنی موت کی خبر سنی تو آگ بگولا ہو گیا اور اس نے نجومی کو موت کی سزا دے دی۔ سزا دینے کے بعد دوسرے نجومی کو بلایا اور اسے اپنا خواب سنایا دوسرے نجومی نے چند لمحے سوچا اور پھر بادشاہ سلامت سے جان کی امان طلب کرتے ہوئے کہا کہ بادشاہ سلامت آپ ہزاروں لوگوں سے زیادہ زندگی پا کر مریں گے بادشاہ نے نجومی کا جواب سن کر مال و زر سے نواز کر رخصت کر دیا اگر غور کیا جائے کہ دونوں نجومیوں نے ایک ہی بات کہی تھی فرق صرف اتنا

تھا کہ پہلے نجومی نے بے دھڑک اور غلط الفاظ میں بادشاہ سلامت کو خواب کی تعبیر بتائی تھی جب کہ دوسرے نجومی نے نرم اور پر اخلاق لہجے میں تعبیر بتائی۔

دوستی

ضرغام راجہ

اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب دو دوست ملتے ہیں تو وہ آپس میں لڑنے لگتے ہیں یا ایک دوسرے کے ساتھ مذاق کرنے لگتے ہیں اسی طرح ایک دفعہ دو شخص ملے ایک نے دوسرے سے پوچھا "چائے ملے گی؟" دوسرے نے کہا "ملے گی۔" تھوڑی دیر بعد چائے آگئی۔ پہلے نے چائے سے کپ بھر کر دوسرے کو دیا دوسے نے کپ پکڑتے ہوئے پہلے کو کہا "تم بھی پیونا" پہلے نے کہا "ہم تو روز پیتے ہیں" دوسرے شخص نے پہلے کی بات سن کر منہ بنالیا۔ اس نے پہلے کی بات سن کر کہا کیا مطلب ہے ہم نے آج ہی چائے پی ہے؟ چلو رکھو اپنے پاس اپنی چائے اس طرح ایک عام بات پر دونوں میں لڑائی ہوگئی اگر وہ پہلا آدمی گفتگو آداب کو ذہن میں رکھتا اور اس سے کہتا کہ آپ پئیں میں بھی پی لوں گا، تو کونسی قیامت آجاتی۔

آدمی کو اعلیٰ انسانی اقدار اپناتے ہوئے حسن و شائستگی اور اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرنا چاہئے اور بڑوں سے محبت چھوٹوں سے بڑی شفقت و پیار کے ساتھ گفتگو کرنی چاہئے اور ہر کسی کے ساتھ بڑے اخلاص و خلوص اور محبت و ملنساری کے ساتھ پیش آنا چاہئے۔ اسی میں ہم سب کی بھلائی ہے۔

ننھا جاسوس

رانا گلزار احمد

رات کے سناٹے میں ایک چیخ ابھری، اس کے بعد خاموشی چھا گئی یہ چیخ شاید کسی اور نے نہ سنی ہو، مگر رشید کے کان یہ چیخ سن کر کھڑے ہو گئے۔ رشید فوراً اپنے بستر سے اٹھا۔ اور دروازہ کھول کر چپکے سے باہر نکل گیا۔ یہ چیخ کی آواز سیٹھ علی کے گھر سے ابھری تھی رشید نے سیٹھ علی کی کوٹھی کی راہ لی۔ لیکن وہ اچانک دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا کیونکہ اسے ایک کار کے انجن کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی تھی۔ اچانک کار شور مچاتی ہوئی اس کے پاس سے گزر گئی وہ فوراً پہچان گیا کہ یہ ٹویوٹا کار ہے۔ کار ٹھیک سیٹھ علی کی کوٹھی کے پاس سے چلی تھی۔ رشید نے ٹارچ نکالی اور راستہ دیکھتا ہوا اس کی کوٹھی کی طرف بڑھا لیکن گیٹ کے پاس اس کی نظریں ایک چیز پر جم کر رہ گئیں۔ وہاں ایک سفید رنگ کا قلم پڑا ہوا تھا۔ رشید نے اس پین کو اٹھا لیا۔ اس پین پر ڈھکنا بھی نہ تھا۔ اس پر انگلیوں کے سرخ نشانات تھے۔ بالکل ویسے ہی جس طرح کسی شخص کے ہاتھ پر خون لگا ہو، وہ کسی شے کو چھوئے تو وہاں انگلیوں کے سرخ نشان لگ جاتے ہیں ننھے جاسوس نے اسے احتیاط سے اپنے پاس رکھ لیا۔ اور دبے قدموں کوٹھی میں داخل ہوا۔ دروازے پر کھڑے ہو کر گھنٹی بجائی کوئی نہ آیا۔ رشید نے پھر گھنٹی بجائی کوئی نہ آیا۔ وہ سمجھ گیا کہ

دال میں کچھ کالا ہے۔ وہ چپکے سے کھڑکی کے راستے کمرے میں کودا۔ اور آہستہ آہستہ سیٹھ علی کے کمرے کی طرف بڑھا لیکن کسی شے سے ٹکرانے کی وجہ سے وہ زمین پر آرہا جب اس نے اٹھ کر ٹارچ کی روشنی میں دیکھا تو وہ ایک لاش تھی غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ سیٹھ علی کی لاش تھی رشید نے دیکھا کہ سیٹھ علی کی لاش کے دل سے خون بہہ رہا ہے رشید نے فوراً پولیس آفس ٹیلی فون کیا۔ انسپکٹر اسے بخوبی جانتا تھا کیونکہ رشید کئی مشکل مرحلوں میں اس کا ساتھ دے چکا تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد پولیس انسپکٹر مع دو سپاہیوں کے آگیا۔ رشید نے بتایا کہ کوئی شخص سیٹھ علی کو قتل کر کے چلا گیا ہے وہ ٹویوٹا کار میں آیا تھا مگر جاتے ہوئے اس کا قلم گر گیا۔ سو وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔

"شاباش۔ یہ تم نے بہت اچھا کیا۔" پولیس انسپکٹر نے اسے تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ "جناب اگر میں یہ کہوں کہ یہاں پر پہرہ بٹھا دیا جائے تو کتنا اچھا ہو گا کیونکہ مجھے امید ہے جب قاتل اپنی منزل پر پہنچے گا تو قلم نہ پا کر ضرور واپس آئے گا۔ کیونکہ یہ قلم اس کے قاتل ہونے کا پورا پورا ثبوت ہے۔ اور اس پر قاتل کی انگلیوں کے نشان واضح طور پر موجود ہیں۔" رشید نے کہا۔ "بیٹے میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔" اور یہ کہنے کے بعد انسپکٹر نے سپاہیوں کو چھپنے کی ہدایت کی رشید کا اندازہ درست نکلا۔ تھوڑی ہی دیر بعد کار کے رکنے کی آواز آئی۔ ایک سایہ کار سے اترا۔ اس نے سفید ہیٹ پہن رکھا تھا۔ اور کوٹ کے کالر اونچے کر رکھے تھے۔ وہ ایک ٹارچ کی مدد سے اپنا گرا ہوا قلم تلاش کرنے لگا۔ اچانک کمرہ روشنی سے منور ہو گیا۔ اور انسپکٹر نے پستول دکھا کر اسے ہاتھ بلند کرنے کو کہا۔

لیکن یہ کیا؟ اس نے اپنا ہاتھ اٹھاتے وقت انسپکٹر پر جوڈو کا ایک وار کیا انسپکٹر گر گیا اور اس کا سر زمین سے ٹکرا گیا انسپکٹر بے ہوش ہو گیا جیسے ہی وہ شخص واپس جانے کے لئے مڑا۔ دو سپاہی اس پر پل پڑے لیکن پھر جوڈو کام آئی پھر اس نے دونوں سپاہیوں کو آپس میں ٹکرا دیا اور وہ دونوں چوٹوں کی تاب نہ لا سکے اور گر کر بے ہوش ہو گئے وہ شخص ایک دم سے بھاگا۔ جیسے ہی وہ دروازے سے باہر نکلا۔ ایک اور واقعہ پیش آیا۔ اور وہ شخص دھڑام سے نیچے آگرا کیونکہ کسی چھوٹے سے قد کے لڑکے نے اس کے سر پر زور سے ڈنڈا مارا تھا۔ وہ شخص چکرا کر گر گیا اور مزید ضربات سے بے ہوش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد انسپکٹر اور دوسرے سپاہیوں کو ہوش آیا تو انہوں نے دیکھا کہ مجرم بندھا پڑا ہے اور رشید اس کے پاس ڈنڈا لئے کھڑا ہے۔ انسپکٹر نے اسے اس کارنامے پر شاباش دی۔ پھر اس مجرم پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلا۔ معلوم ہوا کہ وہ قاتل جس کا نام ساجد تھا اور جو عام لوگوں میں بجو کے لقب سے جانا جاتا تھا۔ جبراً سیٹھ علی سے جائیداد کے کاغذات اپنے نام منتقل کرانے کے لئے دستخط کروانے آیا تھا۔ لیکن سیٹھ علی کے مسلسل انکار پر قاتل نے اسے قتل کر دیا قاتل کو عدالت میں عمر قید کی سزا ہو گئی اور رشید کو اس کے کارنامے پر ایک ہزار روپے انعام ملے۔ پولیس انسپکٹر نے اسے ایک گھڑی انعام دی۔ مگر ننھے جاسوس کا سب سے بڑا انعام وہ خوشی تھی جو اسے ایک خطرناک مجرم کو پکڑوا کر حاصل ہوئی تھی۔

افسوس

صبا سلیم کراچی

"آئے ہائے بے چاری کے تیسری لڑکی

ہے۔"

اماں بشیراں نے بڑے افسوس سے کہا تو میں نے پوچھ ہی لیا کہ کس کے تیسری لڑکی ہے اور آپ کو اتنا افسوس کیوں ہو رہا ہے؟ "ارے بھئی زرینہ کے ہاں تیسری لڑکی ہوئی ہے، چچ چچ، بیچاری زرینہ کی قسمت ہی خراب ہے۔ سب سے پہلے بھی ایک لڑکی ہوئی تھی، پھر دوسری اور اب تیسری ہو گئی اللہ معاف کرے اس بار اگر لڑکا ہو جاتا تو بیچاری کو کچھ دلاسہ ہو جاتا۔" اماں نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا مجھے تو بہت غصہ آیا۔ میں نے اماں سے کہا۔ "اماں لڑکی ہونے سے تو زیادہ خوشی ہونی چاہئے کیونکہ لڑکیاں تو ماں باپ کی خدمت بھی کرتی ہیں اور کام میں بھی ہاتھ بٹاتی ہیں اور لڑکوں کی طرح ماں باپ کو تنگ بھی نہیں کرتیں۔" میں نے اچھی خاصی تقریر کر ڈالی تو اماں نے کہا۔

"ہونہہ لڑکی تو پرایا مال ہے ایک نہ ایک دن چلی جائے گی ساری عمر ماں باپ پڑھاتے لکھاتے ہیں اور لڑکیاں غیروں میں چلی جاتی ہیں۔" میں نے سوچا کہ اماں سے بحث فضول ہے میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی شام کو جب میں اٹھی تو میں نے سوچا کہ خالہ زرینہ کے ہاں جا کر مُنّی کو دیکھ لوں۔ (زرینہ خالہ ہمارے پڑوس میں رہتی تھیں اور ہم سب انھیں زرینہ خالہ ہی کہتے تھے۔) یہ سوچ کر میں زرینہ خالہ کے گھر چلی گئی وہاں پر بھی یہی موضوع تھا کہ "لڑکا ہو جاتا تو اچھا تھا"

میں نے دیکھا کہ چھوٹی سی گڑیا جیسی پیاری سی بچی پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی اور آنکھیں کھولے پٹر پٹر سب کو دیکھ رہی تھی لیکن اسے کوئی نہیں دیکھ رہا تھا سب اپنی باتوں میں مصروف تھے اور وہ سب کو معصومیت سے دیکھ رہی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ جب نغمہ آنٹی کے یہاں لڑکا ہوا تھا تو سب اسے گود میں لے لے کر پیار کر رہے تھے اور مٹھائی بھی بٹی تھی اور یہاں یہ اکیلی لیٹی تھی میں نے اسے گود میں لے لیا اور خالہ سے اس کا نام پوچھا تو انھوں نے کہا کہ "ان کے ابو کو تو جنّہ نام پسند آیا ہے اس لئے ہم نے اس کا نام جنّہ ہی رکھا ہے۔" میں نے خالہ سے پوچھا کہ جنّہ کا مطلب کیا ہے۔ تو انھوں نے بتایا کہ اس کا مطلب ہے جنّت۔ میں نے جنّہ کی طرف دیکھا اور کہا "اللہ تمہیں لمبی زندگی دے اور قسمت اچھی کرے۔" زرینہ خالہ کہنے لگیں "وہ تو ٹھیک ہے لیکن اگر اس کی جگہ لڑکا ہوتا تو ....." وہ چپ سی ہو گئیں جنّہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اپنی امی کو غور سے دیکھ رہی تھی میں نے جنّہ کو پیار کیا اور خالہ کو خدا حافظ کہہ کر گھر آگئی۔ مجھے جنّہ بہت پسند آئی تھی دوسرے بچوں سے ذرا مختلف سی تھی۔ سنجیدہ سی اور نازک سی بچی تھی۔ میں اکثر جنّہ کے پاس جاتی تھی۔ دو دن سے وہ کچھ کمزور سی لگ رہی تھی اس کی آنکھیں پیلی پیلی سی ہو گئیں تھیں اور ہونٹ بھی کچھ نیلے نیلے ہو گئے تھے خالہ نے بتایا کہ جنّہ کو پیلیا ہو گیا ہے۔ مجھے بڑا افسوس ہوا اور میں مستقل اس کی طبیعت پوچھنے جاتی رہی۔ ایک دن مجھے ایک

بچی نے بتایا کہ "جنّہ مر گئی ہے۔" مجھے یہ سن کر سکتہ سا ہو گیا مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ جنّہ مر گئی ہے۔ میں نے سوچا کہ جنّہ سب سے ناراض ہو گئی تھی اس نے سب سے دوستی کرنا چاہی مگر اس سے کسی نے دوستی نہیں کی کسی کو اس کے ننھے سے وجود سے دلچسپی نہیں تھی اس لئے وہ چلی گئی تھی ہمیشہ کے لئے .... جنّہ جنت میں چلی گئی تھی اور محلے کی کچھ عورتیں اور کچھ مرد ان کے گھر اظہار افسوس کرنے کے لئے آگئے تھے کچھ مرد اس کو قبرستان لے گئے اور عورتیں اپنے گھروں میں لوٹ آئیں .... ایک مہینے پہلے یہ عورتیں اس کی پیدائش پر افسوس کرنے آگئیں تھیں اور اب اس کی موت پر افسوس کر کے جا رہی تھیں۔

اقوالِ زرّیں

دین میں آسانی پیدا کرو۔ سختی نہ کرو۔ لوگوں کو خوشخبری سناؤ۔ انہیں متنفّر نہ کرو۔ (حدیث نبویؐ)

صدقہ دو۔ صدقہ نجات کا ذریعہ ہے۔
(حدیث نبویؐ)

غصّہ نہ کرو کیونکہ غصہ انسان کو اس طرح کھاتا ہے جیسے سوکھی لکڑیوں کو آگ کھا جاتی ہے۔
(نبی کریمؐ)

ذلّت کی زندگی سے عزّت کی موت بہتر ہے۔
(ٹیپو سلطان)

آدمی مر جاتا ہے لیکن اس کے نیک اعمال اسے ہمیشہ زندہ رکھتے ہیں۔

بچوں کی دانائی

محمد عرفان میمن، سکھر

پاکستان بننے سے پہلے قائد اعظم بمبئی سے دہلی جارہے تھے رات کے ڈیڑھ بجے کے قریب ان کی گاڑی ایک غیر معروف اسٹیشن پر رکی تو کسی نے زور سے اس ڈبے کی کھڑکی کو کھٹکھٹایا۔ رات سرد تھی قائد اعظم کے ملازم کھڑکی نہیں کھولنا چاہتے تھے۔ قائد اعظم کے کہنے پر انہوں نے کھڑکی کھولی تو دیکھا کہ دو کمسن بچے سردی میں کانپ رہے ہیں۔ قائد اعظم کو بڑا تعجب ہوا اور پوچھا۔

"تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟"

بچوں نے جواب دیا۔ "ہم آپ کو دیکھنے آئے ہیں۔"

قائد اعظم نے پھر پوچھا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں اس گاڑی سے آرہا ہوں؟۔"

بچوں نے جواب دیا۔ "ہم نے اخبار میں پڑھا تھا۔ اور ہم آپ سے ملنا چاہتے ہیں کیوں کہ آپ ہمارے لئے پاکستان بنا رہے ہیں۔"

قائد اعظم نے کچھ سوچ کر کہا۔ "اچھا پاکستان کا مطلب کیا ہے۔"

بچوں نے جواب دیا۔ "وہ ملک جہاں مسلمانوں کی حکومت ہوگی۔"

قائد اعظم نے یہ واقعہ ۱۱ جولائی ۱۹۴۷ء کو ایک تقریر میں سنایا اور آخر میں کہا کہ "دیکھئے گاندھی اور نہرو کہتے ہیں کہ انہیں پاکستان کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا حالاں کہ یہ چھوٹے بچے بھی اس بات کو سمجھتے ہیں۔"

اپنی نگارشات
صاف خوشخط کاغذ کے ایک
جانب ایک سطر چھوڑ کر لکھیں

نقل شدہ، طویل اور
غیر معیاری تحریریں شائع
نہ ہو سکیں گی

جو تحریر آپ ہمیں بھجوائیں
اس کی نقل اپنے پاس محفوظ رکھیں
اور ہم سے واپسی کا تقاضہ نہ کریں

چار بد نصیب

نامعلوم، ایبٹ آباد

سرور دو عالم حضرت محمدؐ نے فرمایا "چار آدمی جہنم میں ایسے ہوں گے۔ جن کی وجہ سے اہل جہنم بھی پریشان ہوں گے جہنمی لوگ آپس میں ایک دوسرے سے کہیں گے ہم تو پہلے ہی تکلیف میں تھے۔ ان بدبختوں نے مزید ہم کو اذیت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ ان چار میں سے ایک وہ ہو گا جسے آگ کے صندوق میں بند کر دیا جائے گا۔ دوسرا وہ ہو گا جس کی انتڑیاں باہر نکل رہی ہوں گی وہ اپنی انتڑیوں کے ساتھ ادھر ادھر بھاگ رہا ہو گا تیسرا وہ شخص ہو گا جس کے منہ سے خون اور پیپ بہہ رہی ہو گی۔ چوتھا وہ شخص ہو گا جو اپنا گوشت کاٹ کاٹ کر کھا رہا ہو گا۔ صندوق والے جہنمی کو دیکھ کر دوسرے جہنمی پوچھیں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ یہ شخص اس حالت میں مرا کہ اس کے ذمے لوگوں کا مال باقی تھا۔ لیکن باوجود قدرت و دولت کے اس نے دوسروں کا مال واپس نہ کیا۔ دوسرے شخص کے بارے میں اللہ فرمائے گا کہ یہ شخص اپنے پیشاب کے چھینٹوں سے بچنے کا اہتمام نہیں کرتا تھا۔ تیسرے کے بارے میں ارشاد ہو گا کہ یہ شخص برے الفاظ میں دلچسپی لیتا تھا۔ چوتھے کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ یہ شخص پیٹھ پیچھے لوگوں کی برائیاں کرتا تھا ادھر ادھر چغلی کرتا رہتا تھا۔

یوم آزادی

محمد مزمل گوجرہ

ملک	یوم آزادی
پاکستان	۱۴ اگست ۱۹۴۷ء
شام	۱۷ اپریل ۱۹۴۶ء
نائجیریا	یکم اکتوبر ۱۹۶۰ء
مراکش	۲ مارچ ۱۹۶۵ء
یوگینڈا	۹ اکتوبر ۱۹۶۲ء
سوڈان	یکم جنوری ۱۹۵۶ء
تیونس	۲۰ مارچ ۱۹۵۶ء
الجزائر	یکم جولائی ۱۹۶۲ء
جمہوریہ چاڈ	۱۱ اگست ۱۹۶۰ء
انڈونیشیا	۱۷ اگست ۱۹۴۵ء
مصر	۲۳ جولائی ۱۹۵۲ء
اردن	۲۲ مارچ ۱۹۴۶ء
ماریطانیہ	۲۸ نومبر ۱۹۶۰ء

واہ رے میرے چھوٹو واہ

عطا حسین ملک

گھر سے لے کر نکلے بستہ
بھول گئے اسکول کا رستہ
مار گئی ویڈیو کی چاہ
واہ رے میرے چھوٹو واہ

سبق نہیں کچھ یاد کیا
وقت کو یوں برباد کیا
فیل ہوئے تو نکلی آہ
واہ رے میرے چھوٹو واہ

ہر دم کھیل کو ہیں تیار
سارے نکمے ان کے یار
چل نہیں سکتے سیدھی راہ
واہ رے میرے چھوٹو واہ

پیسے میں یوں آگ لگائیں
الم غلم سب کھا جائیں
خرچ کریں، ہوں جیسے شاہ
واہ رے میرے چھوٹو واہ

معلومات پاکستان

مرسلہ: عظمیٰ ادریس ..... کراچی

۱) پاکستان کا پہلا ڈاک ٹکٹ کب جاری ہوا؟
۲) پاکستان کا سب سے چھوٹا شہر کون سا ہے؟
۳) پاکستان کا پہلا سکہ کب جاری ہوا؟
۴) پاکستان کا قومی مشروب کیا ہے؟
۵) پاکستان میں کتنی تاریخی یادگاریں ہیں؟
۶) پاکستان میں سب سے زیادہ گرمی کہاں پڑتی ہے؟
۷) پاکستان کی واحد سائنسدان خاتون کا نام بتایئے؟
۸) پاکستان کے خلائی تحقیقات کے ادارے کا کیا نام ہے؟
۹) پاکستان کے سب سے خوبصورت پہاڑی سلسلے کا کیا نام ہے؟
۱۰) پاکستان کا سب سے بڑا پاور ہاوس کہاں ہے؟

۱) ۹ جولائی ۱۹۴۸ء
۲) جہلم
۳) ۳ جنوری ۱۹۴۸ء
۴) گنے کا رس
۵) تقریباً ۵ سو
۶) سبّی
۷) ڈاکٹر نسیمہ ترمزی
۸) سپارکو
۹) قراقرم
۱۰) حیدر آباد

اچھی کتابیں

سرمایۂ حیات بھی رفیقِ زندگی بھی

طالبان
علم وادب کے لئے
گرین گائیڈ اکیڈمی کی شائع کردہ
نادر اور حسین کتابیں اب انتہائی خصوصی رعایت کے ساتھ دستیاب ہیں۔

اس پیشکش کا آج ھی فائدہ اُٹھائیے

یہ کتب آپ کے علمی خزانے میں گرانقدر اضافہ ہوں گی۔

	موجودہ قیمت مع ڈاک خرچ	بعد از رعایت مع ڈاک خرچ
۱ سب سے بڑا انسان ﷺ۔ سیرت طیبہ پر سید نظر زیدی کی اہم تصنیف صدارتی ایوارڈ یافتہ۔ ڈی لکس ایڈیشن	۴۰ روپے	۲۵ روپے
۲ راہ نما قرآنی حکایات کا دلچسپ مجموعہ	۱۰ روپے	۸ روپے
۳ سفر مبارک حجاز مقدس کا سفر نامہ بھی راہنما بھی	—	صرف ڈاک خرچ ۴ روپے
۴ تعلیم الاسلام ۴ حصوں پر مشتمل۔ اسلام کی بنیادی تعلیمات	—	صرف ڈاک خرچ ۴ روپے
۵ حق اسکواڈ مہماتی کہانیوں کا سنسنی خیز مجموعہ	۱۰ روپے	۸ روپے
٦ کہنا بڑوں کا مانو تعمیر سیرتِ اطفال کے لئے خوبصورت	۴ روپے	۳ روپے

آپ صرف ۵۰ روپے کا منی آرڈر بھجوا کر تمام کتب یکمشت بھی منگوا سکتے ہیں

پتا:۔ گرین گائیڈ اکیڈمی۔ ۱۱۲۔ ڈی سائیٹ کراچی نمبر ۱٦۔ فون نمبر ۲۹۹۱۷۸

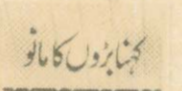

روشن مثال

سہیل حمزہ میمن ۱۵ سال دسویں
بیڈمنٹن کھیلنا، پسندیدہ مضمون انگلش
اہم کامیابی، ساتویں اور آٹھویں میں پہلی پوزیشن
پتہ: گورنمنٹ ہائی اسکول سجاول

غلام شاہ قحطانی ۱۱ سال نہم
مشاغل لکھنا پڑھنا پسندیدہ مضمون سائنس
اہم کامیابی پہلی تا ششم اوّل پوزیشن
گورنمنٹ ہائی اسکول کہڈان ضلع تربت مکران

شوکت گوہر ۱۶ سال نہم
مشاغل کرکٹ کھیلنا، قلمی دوستی، پسندیدہ مضمون انگلش
اہم کامیابی آٹھویں کلاس میں فرسٹ پوزیشن
پتہ: شوکت گوہر، پوسٹ بکس نمبر ۲۷ ٹنڈو آدم سندھ

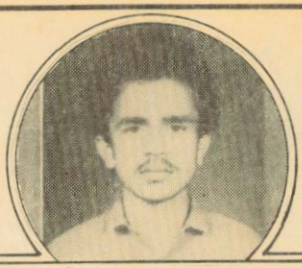

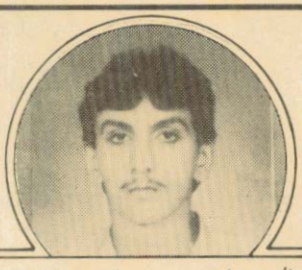

اشعر فواد ۱۶سال فرسٹ ایئر
مشاغل معلوماتی رسائل پڑھنا، پسندیدہ مضمون اسلامیات
اہم کامیابی مڈل اسٹینڈرڈ امتحان میں اسکول میں دوم
پتہ مکان نمبر ۱۴۶ نیو ولایت آباد نمبر ۴ . ملتان

اے ڈی عندلیب ۱۷سال گیارہویں
مشاغل صحافت، قلمی دوستی کرنا، پسندیدہ مضمون اردو
اہم کامیابی میٹرک میں اے گریڈ
پتہ منڈی مدرسہ تحصیل و ضلع بہاولنگر

فیصل اختر کاہلوں ۱۷سال بارہویں
مشاغل باغبانی پسندیدہ مضمون بیالوجی
اہم کامیابی میٹرک میں فیصل آباد بورڈ میں سیکنڈ
پتہ ۷۔ایف سیٹلائٹ ٹاؤن جھنگ صدر

خواجہ منتجب الدین ۱۵سال نہم
مشاغل مطالعۂ کتب، پسندیدہ مضمون بیالوجی
اہم کامیابی آٹھویں میں پہلی پوزیشن
پتہ ۱۸۰۶/۲ عزیز آباد فیڈرل بی ایریا کراچی ۳۸

فرحان شاہد ۱۳سال دہم
مشاغل ٹکٹیں جمع کرنا، کتابیں پڑھنا، پسندیدہ مضمون
کیمیا، طبعیات، اہم کامیابی چھٹی اور ساتویں میں
اول پوزیشن، پتہ III ڈی ۴۸/۲۶ ناظم آباد کراچی

مریم صلاح الدین دس سال ششم
مشاغل مطالعہ، تقریر کرنا، پسندیدہ مضمون اردو
اہم کامیابی پہلی سے پانچویں تک اول
پتہ کراچی اپارٹمنٹ فلیٹ ۲۰ بلاک ۲ گلشن اقبال کراچی

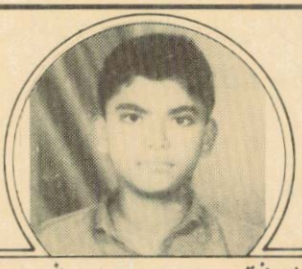

امی ابو کا صفحہ

نئی نسل کی کردار سازی
اور تربیت کے لئے راہ نما خطوط

کبھی کبھار ادارے کو کوئی ایسا خط مل جاتا ہے کہ اسے پڑھ کر دل دہل جاتا ہے۔ ایسا ہی ایک خط پچھلے دنوں ہمیں ڈاک سے ملا۔ مکتوب نگار بچی نے ہدایت کی کہ! اسے شائع نہ کیا جائے۔ لیکن ہم اسے معمولی کانٹ چھانٹ کے بعد نام کے بغیر چھاپ رہے ہیں۔ اس خط کو پڑھیئے اور ذرا اپنے گھر کا جائزہ لیجئے کہ کیا آپ کے گھر کا ماحول بھی ایسا ہی تو نہیں اور آپ کا بچہ بھی اسی کرب کا شکار تو نہیں جس کا اظہار اس خط میں کیا گیا ہے

(ادارہ)

میری عمر تیرہ سال ہے۔ میں ان بچوں میں ہوں جن کو ماں باپ پیار نہیں کرتے اور پیسے دے کر سمجھتے ہیں کہ ہم نے بڑا تیر مار لیا۔ دنیا میں کچھ بچے احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں۔ میں بھی شاید ان میں سے ایک ہوں۔ ہم لوگ تین بہنیں اور تین بھائی ہیں۔ میری نظر میں بہت کم بچے گھر میں خود ہی پڑھتے ہیں۔ میں بھی خود ہی پڑھتی ہوں اور بہت کم پڑھتی ہوں اور جس دن نہیں پڑھتی گھر کے لوگ میرے کمرے کا دروازہ بند کر دیتے ہیں۔ ایک بھائی سے میری پورے سال لڑائی رہتی ہے۔ منجھلا بھائی مجھے اچھا لگتا ہے کیونکہ وہ واحد فرد ہے جو مجھے پیار کرتا ہے۔ ابو، ویسے تو مصروف آدمی ہیں لیکن جب بھی ان کے پاس وقت ہوتا ہے تو وہ کونسا اپنے بچوں کو وقت دے دیتے ہیں۔ ابو زیادہ تر میری اس بہن سے جو بہت پڑھتی ہے پیار کرتے ہیں۔ ٹھیک ہے وہ زیادہ پڑھتی ہے لیکن ابو کو سب کو پیار کرنا چاہئے۔ ایک مرتبہ میری بہن نے مجھے رسیوں سے باندھا تھا اور پورے دن باندھے رکھا۔ میں سوچتی ہوں کہ میں گھر سے بھاگ جاؤں یا خودکشی کر لوں مگر بھاگ جانے سے اپنا نقصان ہوگا اور خودکشی سے گناہ۔ میں اللہ تعالیٰ سے کہتی ہوں کہ اس نے خودکشی کو حرام قرار کیوں دیا۔ ہمارے گھر میں آئے دن اکثر بھائی بہنوں میں جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ والدین چھوٹوں کو زیادہ پیار کرتے ہیں لیکن میرا تجربہ ہے کہ والدین بڑوں کو زیادہ پیار کرتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ میرے لئے دعا کریں گے کہ گھر کے سب لوگ مجھے پیار کریں۔

خدا حافظ

رس بھرے پھل، رسیلا نورس
قومی مشروب
نورس
نورس
UQRA
نورس
قدرت نے ذائقہ دیا، احمد نے محفوظ کیا

REGD. No. M-266 AUGUST 1991
MONTHLY AANKH MACHOLEE KARACHI